ISSN 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

دسمبر ۲۰۱۹ء تا مئی ۲۰۲۰ء

قیمت: ۲۵؍روپے

گوشۂ رشید حسن خاں

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

Scanned with CamScanner

سلام لکھنؤ کی جانب سے مصنفین اودھ ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے ایڈیٹر ادبی نشیمن۔

معروف شاعر اور مضمون نگار انس مسرور (ٹانڈہ، امبیڈکرنگر) کو
ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ادارۂ ادبی نشیمن کی جانب سے 'ادبی نشیمن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

Scanned with CamScanner

دسمبر ۲۰۱۹ء تا مئی ۲۰۲۰ء
ISSN 2581-5482
جلد : ۳
شمارہ : ۲-۱

سہ ماہی ادبی نشیمن

ADBEE NASHEMAN

Email
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شارہ : ۲۵؍روپے
سالانہ ممبر شپ مع رجسٹرڈ ڈاک: ۱۲۵؍روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک): $ 15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبر شپ : دو ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کیلئے : ۶۵؍روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ 226003

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Allahabad Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No. : 50489096237
IFSC : ALLA0212170

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168, Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد
Mob.: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر

رفعت عزمی
Mob.: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
- ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)

تزئین کار: وقار حسین رضوی

'ادبی نشیمن' میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات
کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔
ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

Scanned with CamScanner

فہرست عناوین

آغاز

۱	حمد باری	سید اطہر حسین	۳	۲	نعت	نیر سلطانپوری	۳

اداریہ

۳	اداریہ	ایڈیٹر	۴

مضامین

۴	مہاتما گاندھی کی شخصیت اور افکار و نظریات	داؤد احمد	۵
۵	تحقیق کا درِ شہوار؛ رشید حسن خاں	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۱۱
۶	'دستنبو' کے اُردو ترجمے کا قضیہ اور رشید حسن خاں	ابراہیم افسر	۲۳
۷	اُردو املا اور زبان و قواعد کی اصلاح میں رشید حسن خاں کا کردار	خالد ظہیر	۲۸
۸	رشید حسن خاں تحقیق و تنقید و تدوین کے حوالے سے	ڈاکٹر ظفر عالم	۳۴
۹	تحقیق و تدوین کی مثالی شخصیت رشید حسن خاں	ظہیر حسن ظہیر	۳۸
۱۰	رشید حسن خاں؛ ہمہ جہت شخصیت	صالحہ صدیقی	۴۲
۱۱	رشید حسن خاں کے مشاغل	توصیف بریلوی	۴۵
۱۲	شام اودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں	عبد الحیٔ	۵۰
۱۳	طویل نظم ؛مختصر جائزہ	ڈاکٹر آفتاب عرشی	۵۶
۱۴	نوطرزِ مرصع؛ ایک اجمالی تعارف	غلام علی اخضر	۶۳
۱۵	ابراہیم گلستاں کی زندگی اور کارنامے پر ایک نظر	سید اختر حسین رضوی	۶۷

منظومات

۱۶ و ۱۷	انس مسرور انصاری ،مصداق اعظمی (قطعات)	۷۱	مرغوب اثر فاطمی، طاہر حسین طاہر (غزلیں)	۷۲
۱۸ و ۱۹	احمد نثار ،ظفر اقبال ظفرؔ (غزلیں)	۷۳	اختر ریاض، جواد حیدر جواد (غزلیں)	۷۴

افسانے اور انشائیہ

۲۰ و ۲۱	شیخ چھچھو	ذاکر حسین ذاکر	۷۵	وہم	سکندر علی شگن	۷۹
۲۲	اشتہاری شاعر (انشائیہ)	ساجد جلالپوری	۸۱			

تبصرے

۲۳	نذر شارب (مصنف: اویس سنبھلی)	مبصر: شاہد حبیب	۸۶
۲۴	رشید حسن خاں؛ تحریروں کے آئینے میں (ابراہیم افسر)	مبصر: ظفر عالم	۸۷

مراسلات

۲۵	خطوط	ادارہ	۸۸

Scanned with CamScanner

سید اطہر حسین

حمد باری

خلق عالم اس طرح اللہ اکبر کر دیا
ذات کو اپنی چھپا کر ذکر گھر گھر کر دیا

اپنی محفل کو سجایا دے کے اس نے اذن عام
میکشوں کے واسطے گردش میں ساغر کر دیا

بخش سکتا ہے مرے اشکوں کو بھی حسن قبول
وہ کہ جس نے قطرۂ باراں کو گوہر کر دیا

اس کی قدرت لازوال اور اس کی رحمت بے مثال
اس نے جب چاہا تو قطرے کو سمندر کر دیا

اس کے ذکر و فکر سے دل کو میسر تھا سکوں
مصلحت ہوگی، اسی دل کو جو مضطر کر دیا

یہ بھی اے حسن ازل ادنیٰ کرشمہ ہے ترا
ذرۂ خاکی کو مہر و ماہ و اختر کر دیا

شکر تیرا ہو ادا اس کا طریقہ بھی بتا
جب خود اپنے بندۂ عاصی کو اطہرؔ کر دیا

نیرؔ سلطانپوری

نعت

احمدؐ کے لئے زیبا ہے نورِ خدا کہنا
سایہ ہی نہ ہو جس میں اس جسم کا کیا کہنا

توحید مقدم کی، اقرار نبوت پر
ورنہ بہت آساں تھا بندے کو خدا کہنا

بخشی ہے محمدؐ نے دنیا کو حیاتِ نو
زیبا ہے پھر ایسے کو اعجاز نما کہنا

ذہن بشریت پر اصنام ہی غالب تھے
سیکھا ہے محمدؐ سے دنیا نے خدا کہنا

مرنے کا طریقہ بھی جینے کا سلیقہ بھی
تعلیم پیمبرؐ کا اللہ رے کیا کہنا

افلاک کے پردوں سے دم بھر میں گزر جانا
یہ حسن لطافت ہے اس حسن کا کیا کہنا

حائل ہے حقیقت کا محرم ہے مشیت کا
ہے حد ادب نیرؔ اب اس کے سوا کہنا

نظریہ

ہم معذرت خواہ ہیں کہ ستمبر تا نومبر 2019 کا شمارہ جو رشید حسن خاں پر مرکوز تھا، اس کی اشاعت تعطیل کا شکار رہی لہٰذا ادارتی بورڈ نے ستمبر تا نومبر 2019 اور دسمبر 2019 تا فروری 2020 کا شمارہ مشترکہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اردو ادب میں ماہر لسانیات رشید حسن خاں ایک محقق، ناقد اور مدون کے علاوہ اردو املا اور زبان و قواعد کی نئی نئی اصلاحات و اصطلاحات کے طور پر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ تلفظ، املا اور قواعد پر ان کی بے حد عمیق و غائر نظر تھی۔ انہوں نے تحقیق کے میدان میں جو بھی کام انجام دیا وہ پوری ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ کیا جبکہ تحقیق کے ساتھ تدوین اور تجزیہ نگاری میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ اردو املا، انشاء اور تلفظ، تدوین تحقیق روایت، زبان اور قواعد، اردو کیسے لکھیں ان کی وہ شاہکار کتابیں ہیں جس سے وہ دوسرے محققین و مدونین سے الگ نظر آتے ہیں۔

کسی موضوع یا کسی شخصیت پر مضمون لکھوانا، وہ بھی بلا اجرت اس کا اندازہ عام قاری نہیں لگا سکتا۔ اس کا تلخ تجربہ تو بلا اجرت مضمون لکھوانے والے مدیر کو ہی ہو سکتا ہے۔ بہر حال رشید حسن خاں پر مضمون لکھوانے کے لئے مجھے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا ذکر یہاں کرنا ادبی غیبت ہوگی۔ خیر! جن مضمون نگاروں نے میری درخواست پر اپنی گرانقدر تحریریں ارسال کر رکھی ہے اس شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، میں ان تمام مضمون نویسان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔

بے حد خوشی کی بات ہے کہ 'ادبی نشیمن' دو برس کی مدت پورا کر چکا ہے اب تیسرے سال میں پیش رفت کر رہا ہے۔ اس دورانیہ میں انور جلال پوری اور پروفیسر محمود الٰہی پر خصوصی شمارے کے ساتھ عام شمارے جو منظر عام پر آئے اس کی توقع سے کہیں زیادہ پذیرائی ہوئی۔ جبکہ ادبی نشیمن کے قارئین کی وابستگی میں بھی اطمینان بخش اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ہم اپنے قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جس طرح سے شعراء اور تخلیق کاروں کا قلمی تعاون ہمیں حاصل ہو رہا ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا تو ان شاء اللہ اس کی اشاعت کو مزید معیاری بنانے کی کوشش جاری رہے گی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی چیرمین شپ میں جو آئین کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کمیٹی میں دیگر تمام اراکین کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، خان عبدالغفار خاں، بریسٹر آصف علی، عبدالرحیم چودھری، بیگم اعزاز رسول اور محمد سعداللہ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد جو دستور تیار ہوا وہ 26 جنوری 1950 میں ''آئین ہند'' کے نام سے نافذ ہوا اور اس تاریخ کو یوم جمہوریہ کا نام دیا گیا، یوم جمہوریہ کے اس موقع پر ہم ملک کے تمام باشندوں کو بے شمار مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ادبی مشیر جناب رفعت نعیم صفوی طویل علالت کے بعد اب صحتیاب ہو چکے ہیں۔ موصوف نے ایک بار پھر ادبی نشیمن کو اپنی خدمات دینے کی سفارش قبول کر لی ہے۔ ادارہ ادبی نشیمن ان کا خیر مقدم کرتا ہے اور ان کی مکمل صحتیابی کی دعا کرتا ہے۔

ممبئی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر صاحب علی اور ''کہاں ہے میرا ہندوستان'' جیسی نظم کے خالق جناب اجمل سلطان پوری کے انتقال پر ملال یقیناً اردو ادب کا ایک بڑا خسارہ ہے۔ ادارہ انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

Scanned with CamScanner

مہاتما گاندھی کی شخصیت اور افکار ونظریات

داؤد احمد

صدر شعبۂ اردو، فخر الدین علی احمد
گورنمنٹ پی جی کالج
محمود آباد، سیتاپور
رابطہ: 8423961475

انسانی تاریخ کے صفحات آج بھی ان عظیم انسانوں کے کارناموں سے جگمگا رہے ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کی بقا اور ترقی کی خاطر اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ایسی ہی تاریخ ساز شخصیات میں موہن داس کرم چند گاندھی کا شمار کیا جاتا ہے۔ان کے ہمہ جہت شخصیت اور گراں قدر کارناموں نے انھیں بابائے قوم اور مہاتما گاندھی کے نام سے مقبولیت کا تاج پہنایا۔مہاتما گاندھی نہ صرف ہندوستانی تاریخ بلکہ عالمی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں جنھیں آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔ان کی شخصیت کی سادگی اور ان کے افکار کا تنوع عام دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور ثقافتی ملک میں وہ اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔گاندھی جی نے ایثار وقربانی کی ایسی نظیریں قائم کی ہیں کہ ان کا نام آج کی تیز رفتار دور میں بھی انتہائی عزت واحترام سے لیا جا رہا ہے۔اگر ہم ان کی عملی زندگی کا طائرانہ جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستانیوں کی عزت نفس آزادی اور خود مختاری کے لئے اپنی جان نچھاور کر دی۔وہ شروع سے ہی مختلف مذاہب اور فرقوں میں رواداری اور دوستانہ تعلقات کے حامی رہے۔اپنے اخلاق، کردار، تعلیمات، نظریات اور اپنے فلسفہ عدم تشدد کے پیش نظر موہن داس کرم چند گاندھی کو 'مہاتما' کے لقب سے نوازا گیا۔اپنے ملک کے لئے ان کی جو خدمات رہی ہیں، وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

مہاتما گاندھی بلا شبہ ایک عظیم شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے اپنی زندگی میں سچائی، عدم تشدد، انصاف اور رواداری کے اقدار کو اتار کر جو تعلیمات اور نظریات دئے۔انھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔خاص طور پر عدم تشدد، جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھا، اور جن پر وہ نہ صرف پوری زندگی خود چلے بلکہ دوسروں کو بھی چلنے کی ترغیب دی۔اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ 'عدم تشدد سے پیدا ہونے والی طاقت انسان کے ایجاد کردہ ہتھیاروں سے بدرجہا بہتر ہے۔' مہاتما گاندھی کی شخصیت کی جو سحر انگیزی تھی، وہ ان کے گفتار اور کردار کی ہم آہنگی کی وجہ سے تھی۔

Scanned with CamScanner

انھیں انسانی، روحانی اور مذہبی افکار و نظریات پر مکمل یقین تھا۔ جس کے باعث وہ محبت، اخوت، مساوات، صداقت، انسانی دوستی اور یکجہتی کے پیکر بنے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جہاں بھی، جس جگہ بھی جن کے دلوں میں مساوات اور سچائی کا عنصر ہوگا، وہاں تشدد غالب نہیں ہوگا۔ مہاتما گاندھی کی ان ہی بنیادی اصولوں کی علمبرداری اور اوصاف سے متاثر ہوکر رابندر ناتھ ٹیگور جیسی عظیم شخصیت نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'مہاتما' کا درجہ دیا تھا، جو ہمیشہ کے لئے ان کے نام کا حصہ بن گیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک موہن داس کرم چند گاندھی، اپنے مہاتما ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔ ان کی پوری زندگی انسانی رواداری اور اقدار کے لئے وقف رہی۔

البرٹ آئنسٹین نے مہاتما گاندھی کے بارے میں لکھا ہے" آنے والی نسلیں مشکل سے ہی اس بات پر یقین کریں گی کہ گاندھی جیسا گوشت پوشت کا پتلا کبھی اس سرزمین پر پیدا ہوا ہوگا۔" آئنسٹین نے شاید یہ بات اس لئے کہی تھی کہ مہاتما گاندھی کی نادر شخصیت کو نئی نسل کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہونگے کیوں کہ مہاتما گاندھی نے ایسے کارنامے انجام دئے ہیں کہ جن کو سن کر تعجب ہوتا ہے اور فوراً یقین نہیں ہوتا کہ واقعی کسی شخص نے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہوں گے۔ گاندھی جی اپنے زمانے کی عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے ان کی آواز میں، ان کی شخصیت میں، ان کے لمس میں اور ان کی نظر میں ایک حیرت انگیز جادو تھا جب کوئی بھی شخص ان کے سامنے آتا تھا تو اس کا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔ ان کی قدآور شخصیت سے متاثر ہوکر ان کے عزیز ترین دوست ہنسری پولک نے لکھا تھا" ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ گاندھی کیا چیز ہیں لیکن اتنا یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہاں ہیں وہاں ہیں۔" ہنسری پولک کے الفاظ میں اتنی وسعت ہے کہ انھیں گاندھی کی شکل ہر جگہ دکھائی دیتی تھی، گاندھی کی شکل میں انھیں ایک ایسی شخصیت نظر آتی تھی جو دنیا میں رہنمائی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل گاندھی جی بھارت کے ارتقا کی جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ گاندھی جی ان عظیم اور لافانی شخصیات میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی جگہ آج تک ہندوستانی سیاست وقیادت کے میدان میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکی اس بیدار ذہن، عدل پرست اور دور اندیش سیاستدان کو جو زمانہ میسر ہوا وہ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے میں انتشار اور بدحالی کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ عوام وخواص دونوں ہی پریشان اور زبوں حال تھے اپنے ہی وطن عزیز کی سیاست و معیشت کی باگ ڈور غیر اقوام کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی، مذہب، اخلاق، شرافت اور انسانیت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت و حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی، امن و آشتی، اخوت وانسانیت اور محبت وشرافت جیسی بہترین انسانی صفات محض خواب وخیال کی باتیں بن کر رہ گئیں تھیں۔ انگریزی حکومت کی حیلہ پروریوں، فریب کاریوں، سفاکانہ سازشوں اور جابرانہ فیصلوں نے ہندوستانیوں کی صفات و دانشمندانہ اور جرات مردانہ کو گویا سلب کر لیا تھا، ایسے نازک اور پرآشوب دور میں مہاتما گاندھی نے خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم کی بیداری کے لئے جو سیاسی حکمت عملیاں اختیار کیں اور کارہائے گرانقدر انجام دئے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کہیں اور ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک گاندھی جی سیاستدان ہونگے۔ کچھ لوگوں کے لئے وہ فلسفی ہونگے، کچھ لوگوں کے لئے وہ آزادیٔ ہند کے جانثار سپاہی ہونگے اور کچھ لوگوں کے لئے وہ محض ایک اچھے انسان ہوں گے۔ سیاست میں رہتے ہوئے انسان کا اچھا انسان بنا رہنا کچھ دشوار سا عمل ہے مگر گاندھی جی کی یہ خوبی تھی کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے ایک اعلیٰ انسان تھے۔ بقول مولانا آزاد

"اچھا انسان ہونا ایک ایسی عظمت ہے جو بڑی عام سی دکھائی دیتی ہے مگر کم ہی خوش نصیبوں کے حصے میں یہ خصلت آتی ہے۔ واقعی میں گاندھی جی بہت اچھے انسان تھے۔"

گاندھی جی امن پسندی اور صلح جوئی کے قائل تھے وہ اس لئے کیوں کہ انھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بدھ مت کی تعلیمات کا مطالعہ گہرائی سے کیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے خیالات کا اظہار ایک مرتبہ کچھ اس انداز میں کیا کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ زندگی موت کی آغوش میں، سچائی جھوٹ کے درمیان اور روشنی اندھیرے کے بیچ میں اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ خدا زندگی، سچائی اور نور ہے اور وہ محبت اور اعلیٰ ترین وجود ہے۔ گاندھی جی ایک مذہب پسند لیڈر تھے لیکن ان کا مذہب ان کی پاؤں کی زنجیر بننے کے بجائے ان کی ذہنی وسعت کا سبب بنا۔ انھوں نے اپنے مذہب، نظریات پر قائم

Scanned with CamScanner

رہتے ہوئے مختلف فرقوں میں بہتر تعلقات کی نہ صرف پر زور وکالت کی بلکہ ان کی پوری زندگی فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے عبارت ہے۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جنوبی افریقہ میں گزارا جہاں انھوں نے زندگی کے ۲۱ سال گزارے، جنوبی افریقہ میں انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے شہری حقوق کے لئے جدو جہد کی جس کی بنیاد پر وہ کافی عرصہ جیل میں رہے۔جیل سے باہر رہ کر انھوں نے ستیا گرہ کیا اور اس طریقے سے ان کے نظریات اور پختہ ہوتے گئے۔جنوبی افریقہ میں کئے گئے ستیا گرہ کا تجربہ انھوں نے ہندوستان آکر دہرایا۔یہاں پر انھوں نے اپنی تحریک کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں میں آپس میں اتحاد کی فضا ہموار کی۔

تحریک خلافت ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے والی ایک بڑی تحریک ہے۔جس میں ہندو اور مسلمانوں میں خلیج کو کم کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا۔گاندھی جی کی تحریکوں میں کئی تحریکیں ایسی ہیں جو انھوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کیں۔ان تحریکوں کے شروع کرنے کا مقصد فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہوئے علاقوں میں جا کر امن و امان قائم کرنا اور مختلف فرقوں میں پیدا ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا۔گاندھی جی کے امن پسندانہ نظریات و افکار نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی جینے کا قرینہ وسلیقہ بخشا اور بڑے بڑے سر کشوں ،ظالموں، تند خو اور تنفر پھیلانے والے لوگوں کی فکر میں انقلاب عظیم برپا کر کے رکھ دیا:

”مہاتما گاندھی نے سچ اور اہنسا دونوں کو اپنی زندگی کا اصول بنایا تھا جو صرف منھ سے ہی نہیں بلکہ اپنی ساری زندگی کے ہر ایک کام سے انھوں نے اس کا سبق ہندوستانیوں اور ہر ایک انسان کو سکھایا“۔

(باپو کے قدموں میں، راجندر پرساد ترجمہ محمد عبد الغفار، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۳ء، صفحہ:۲۱۵)

مہاتما گاندھی نے ہمیشہ اس نقطے پر زور دیا اور باور کرایا کہ ملک کی تعمیر و ترقی کی راہیں اتحاد میں پوشیدہ ہیں۔اس کا سب سے اہم مظہر تو جدو جہد آزادی کی تحریک ہے۔کیوں کہ نہ صرف گاندھی جی بلکہ آزادی کے بیشتر رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے بغیر آزادی کا حصول ممکن نہیں۔گاندھی جی نے مختلف مواقع پر نہ صرف اتحاد پر زور دیا بلکہ تہذیبی، تاریخی اور مذہبی دلائل کی روشنی میں یہ بات کہی۔اس اتحاد کی تئیں انھوں نے عدم تشدد کے فلسفے کو رہنما اصول کے طور پر پیش کیا اور بتایا کہ برداشت اور ایک دوسرے کو قبول کرنے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہیے:

”ہمیں اپنی باہمی تعلقات میں عدم تشدد کا رویہ اختیار کرنا لازمی ہے۔دونوں فریقوں کا یہ مشترک مقصد ہونا چاہیے کہ ان میں کوئی ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کرے بلکہ جب کبھی اختلافات پیدا ہوں تو دونوں انھیں پنچوں کے ذریعہ سے یا جی چاہے تو عدالتوں کے ذریعہ سے طے کرلیں“۔

(گاندھی جی اور ان کے خیالات، عبد الطیف اعظمی، علمی ادارہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحہ:۸۱)

گاندھی جی نے اپنی حکمت عملی سے بھارت کی عوام کو ایسی راہ دکھائی جس کے نتیجے میں ہمارا ملک برسوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ بھارت پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے اس ملک کو بے تحاشہ لوٹا اور یہاں کی دولت اپنے ملک انگلینڈ لے گئے۔سابقہ حکمرانوں سے انگریز اس لحاظ سے قطعی مختلف تھے کہ انھوں نے بھارت کو کبھی نہیں اپنایا۔انھوں نے اس ملک کو ہمیشہ ایک مفتوحہ مملکت سمجھ کر اسے استعمال کیا۔انگریزوں نے کبھی بھارت کی تہذیب و تمدن کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔انھیں اپنی قومی شناخت اور رنگ ونسل پر بڑا ناز تھا اس لئے وہ کالے بھارتیوں سے ہمیشہ نفرت کرتے رہے۔انگریزوں نے بھارت میں اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرنے کے بجائے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے جبر و استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔مہاتما گاندھی نے پورے ملک میں انگریزوں کی اصلیت کو بے نقاب کر کے آزادی کے جذبے کو عوام کے دلوں میں پیوست کر دیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر برٹش امپائر کو یہ ملک چھوڑنا پڑا۔

گاندھی جی کی شخصیت کے اس انقلابی پہلو سے قطع نظر ہم ان کے خیالات و افکار کا جائزہ لیں تو ان کے ہاں ہمیں ایک جامع اور مربوط نظام زندگی کے شواہد ملتے ہیں۔مہاتما گاندھی ایک قابل رہنما، بہترین انسان اور مفکر بھی تھے وہ فلسفی نہ تھے لیکن انھوں نے دنیا کے سامنے ایک ایسا طرز زندگی اور مسائل حیات سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایسا موثر طریقہ کار تجویز کیا جس کی افادیت دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔گاندھی جی کے نظریات میں سب سے اہم

Scanned with CamScanner

اہنسا یعنی عدم تشدد ہے جسے انھوں نے باضابطہ ایک طریقہ حیات قرار دیا ہے۔گاندھی جی کی تقریروں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے ذات، مذہب، علاقائیت، رنگ ونسل اور لسانی سطح پر مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک دیانت دارانہ کوشش کی تھی۔قومی یکجہتی کا یہی نظریہ ان کی فکر کا بنیادی پتھر ہے جس پر وہ ایک خوشحال قوم کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی نے مختلف مذاہب کی کتابوں اور دنیا کے اہم دانشوروں کے افکار کا مطالعہ کیا تھا۔ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر صبح گیتا کے علاوہ قرآن مجید اور انجیل مقدس کا بھی مطالعہ کیا کرتے تھے۔ان کی کتاب My Experiments With Truth میں اس حقیقت کا اعتراف موجود ہے کہ جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران کئی مسلمانوں سے ان کے گہرے مراسم رہے جو اسلامی تعلیمات کو سمجھنے میں ان کے لئے مددگار ثابت ہوئے۔ان سے جب کسی نے دریافت کیا کہ رام راجیہ کے جس تصور کی وہ بات کرتے ہیں وہ کس قسم کی حکومت ہوگی تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ وہ خلیفہ دوم حضرت عمر کی حکومت کے طرز پر ہوگا۔انگلینڈ میں رہ کر گاندھی جی نے عیسائیت کی اور وکالت کے دوران پارسی لوگوں کے ذریعے ان مذاہب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔وہ تمام مذاہب کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔بنیادی طور پر اپنے آبائی مذہب اور ہندو فلاسفی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔انھوں نے ہندوستانی سماج کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔وہ اس ملک کی سماجی زندگی کے نبض آشنا تھے۔انھوں نے دیگر مذاہب کے افکار وخیالات کے لئے بھی اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھی تھیں۔تحریک آزادی کے دوران ہر طبقے اور ہر علاقہ کے لوگوں سے ان کو سابقہ پڑا۔یہی عوامل تھے جو ان کی قومی یکجہتی کے نظریہ کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔

مہاتما گاندھی کی پوری زندگی انسانی رواداری اور اقدار کے لئے وقف رہی۔ہندومسلم اتحاد کو بھی وہ ضروری قرار دیتے تھے۔اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ 'اتحاد ایک طاقت ہے، یہ صرف کتابی کہاوت نہیں بلکہ زندگی کا ایک اصول ہے، جو سب سے واضح طور پر ہندومسلم اتحاد کے سوال پر صادق آتا ہے۔اگر ہم میں پھوٹ ہوگی تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔اگر ہم ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر تیار رہیں گے تو کوئی تیسری طاقت آسانی سے ہندوستان کو غلام بنالے گی۔ہندومسلمان اتحاد کا مطلب صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ان سب جماعتوں کا اتحاد ہے، جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتی ہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔انسانیت کا جذبۂ ایثار جس طرح ہماری زندگی سے غائب ہورہا ہے، اس ضمن میں مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ 'جو قوم بے شمار قربانیاں پیش کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتی ہے، وہ ترقی کی لا محدود بلندیوں پر پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔جس قدر قربانی حقیقی ہوگی، اسی قدر کامیابی جلد ہوگی'۔نفرت اور عداوت کے تئیں ان کا نظریہ تھا کہ ہم اپنے دشمنوں کو محبت سے جیت سکتے ہیں نفرت سے نہیں۔نفرت اور تشدد میں بہت باریک سا فرق ہے۔

مہاتما گاندی کو اس بات کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ جب تک ہندوستان میں رہنے والے لوگ فرقوں اور ذاتوں میں خود کو تقسیم کرتے رہیں گے، قومیت، مذہبیت اور وطنیت کی اہمیت کو اس کے حقیقی معنی میں سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے تب تک اس ملک و قوم کی آزادی کا حصول ممکن نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے قول وعمل کے ذریعہ وہ ملک میں اتحاد پیدا کرنے اور آپس میں مل جل کر زندگی گزارنے کی جا بجا تلقین وتشویق دلاتے نظر آتے ہیں وہ کسی مخصوص فرقے، جماعت یا مذہب کی سیاست و قیادت میں یقین نہیں رکھتے بلکہ مایوسی وقنوطیت کے دشمن، امن وسلامتی کے حمایتی اور ملک وقوم کے سچے رہنما اور مخلص دوست نظر آتے ہیں، اس سلسلے میں گاندھی جی کے متعلق جواہر لال نہرو کی ایک رائے نقل کی جارہی ہے۔نہرو جی گاندھی جی کی عظمت و اہمیت کا تہ دل سے اعتراف

> گاندھی جی کی شخصیت کے اس انقلابی پہلو سے قطع نظر ہم ان کے خیالات وافکار کا جائزہ لیں تو ان کے ہاں ہمیں ایک جامع اور مربوط نظام زندگی کے شواہد ملتے ہیں۔مہاتما گاندھی ایک قابل رہنما بہترین انسان اور مفکر بھی تھے وہ فلسفی نہ تھے لیکن انھوں نے دنیا کے سامنے ایک ایسا طرز زندگی اور مسائل حیات سے نبردآزما ہونے کے لئے ایسا موثر طریقہ کار تجویز کیا جس کی افادیت دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔گاندھی جی کے نظریات میں سب سے اہم اہنسا یعنی عدم تشدد ہے جسے انھوں نے باضابطہ ایک طریقہ حیات قرار دیا ہے۔گاندھی جی کی تقریروں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے ذات، مذہب، علاقائیت، رنگ ونسل اور لسانی سطح پر مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک دیانتدارانہ کوشش کی تھی۔

Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے ان کو کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

"اس نے تمام ملک کو زیروزبر کر کے رکھ دیا جو کسی بڑے سے بڑے انقلابی سے نہ ہوسکا۔اس نے اپنے مخصوص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیا جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی ،موجوں کی طرح پھیلتی چلی گئیں اور اپنے ساتھ کروڑوں آدمیوں کو بہا کر لے گئیں وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی ہو لیکن یہ اسی کی ذات ہے جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا، ایک پست اور بودی قوم کو عزم و وقار بخشا ،بیداری اور قوت پیدا کی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔" (جواہر لال کی کہانی ،محمد رحیم دہلوی، نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی، ۱۹۴۲،صفحہ: ۳۶۵)

گاندھی جی حکیمانہ نقطۂ نظر سے ملک کے سیاسی ،سماجی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا مشاہدہ و محاسبہ کرنے کے عادی تھے اور اس دور اندیش ہمارے سیاسی وقومی رہنما کی دور بین اور دقیق بین نظروں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا تھا کہ کشور ہند کو زور زبردستی اور شدت و سختی سے انگریزی حکومت کے ظالم اور بے رحمانہ پنجوں سے نہیں چھڑایا جاسکتا آزادی چاہیے تو تمام ہندوستانیوں کو مل جل کر اس کے لئے کام کرنا پڑے گا ۔گاندھی جی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ کوئی بھی طاقتور قوم، کسی بھی دوسری قوم پر صرف اسی وقت تک حکومت کرسکتی ہے جب تک کہ محکوم قوم، حاکم قوم کے ساتھ تعاون وہم آہنگی کا جذبہ رکھتی ہے لیکن اگر محکوم قوم حکمرانوں کی ظالمانہ کاروائیوں کے خلاف متحد و منظم ہوکر صدائے احتجاج بلند کر دے اور اس تعاون کو ترک کردے اور پھر اس پر کتنی بھی سختی اور شدت کیوں نہ کی جائے وہ چپ چاپ ان سب کو برداشت کرتی رہے تو بڑی سے بڑی مضبوط حکومت کو بھی زمین دوز ہونے میں بہت وقت نہیں لگے گا اور واقعی بہت جلد گاندھی کا یہ دعویٰ سچ بھی ہو گیا۔مہاتما گاندھی کے امن پسندانہ تصورات نے سرکش اور ظالم انگریزی حکمرانوں کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہونا پڑا اور اس ملک کو

گاندھی جی حکیمانہ نقطۂ نظر سے ملک کے سیاسی ،سماجی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا مشاہدہ و محاسبہ کرنے کے عادی تھے اور اس دور اندیش ہمارے سیاسی وقومی رہنما کی دور بین اور دقیق بین نظروں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا تھا کہ کشور ہند کو زور زبردستی اور شدت و سختی سے انگریزی حکومت کے ظالم اور بے رحمانہ پنجوں سے نہیں چھڑایا جا سکتا آزادی چاہیے تو تمام ہندوستانیوں کو مل جل کر اس کے لئے کام کرنا پڑے گا۔گاندھی جی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ کوئی بھی طاقتور قوم، کسی بھی دوسری قوم پر صرف اسی وقت تک حکومت کرسکتی ہے جب تک کہ محکوم قوم، حاکم قوم کے ساتھ تعاون وہم آہنگی کا جذبہ رکھتی ہے۔

چھوڑ کر جانا ہی مناسب لگا۔

گاندھی جی نے اپنی تعلیمات وتحریکات کو کسی مخصوص مذہب ،ذات یا قوم کے لئے محدود نہیں رکھا انھوں نے ہندوستان میں بسنے والے بہت سے مذہبوں کی تعلیمات کا وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس نتیجے کو اخذ کیا مذہب کوئی بھی ہو بنیادی تعلیمات تقریباً سب کی ایک ہی جیسی ہیں صرف خالق کائنات کی حمد وثنا کا طریقہ ایک دوسرے سے جدا ہے ان کے نزدیک ہندوستان میں رہنے والا ہر ہندوستانی اپنا دوست اور بھائی ہے، ان کو اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ یہ ملک صرف اسی وقت خودمختار اور آزاد ہوسکتا ہے جب یہاں بسنے والے ہر شخص کو ایک ہی گھر اور خاندان کا فرد مان لیا جائے انھوں نے ہندو اور مسلم تہذیب میں یگانگت ،ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی انھوں نے دیگر مذاہب کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام کا بھی گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا اور آپسی تفریق وتنفر کے جذبات کو مٹانے کے لئے کئی اہم کام کئے، انھوں نے کہا کہ دونوں ہی مذہب کی حقیقی روح بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہت وہم آہنگی رکھتی ہے ،اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے ۲۴ر جون ۱۹۳۴ میں پونا میں یوم عید میلاد النبی کے موقع پر ایک جلسے میں شرکت کے دوران اپنی ایک تقریر میں کیا تھا وہ کہتے ہیں:

" آپ سب لوگ قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں اگر آپ قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کریں اور ہندو اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیم کے عامل ہوں تو فرقہ وارانہ جھگڑے مٹ جائیں۔"

(جواہر لال کی کہانی، محمد رحیم دہلوی، نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی، ۱۹۴۲،صفحہ: ۲۰-۴۱۹)

مہاتما گاندھی مذہبی اعتبار سے بہت وسیع القلب اور صحیح الفکر انسان تھے۔وہ ہندوستانیوں کے لئے محبت وآشتی اور اخوت وانسانیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔انھوں نے جو کچھ بھی کہا پہلے اس پر خود عمل کرکے دکھایا اس کے بعد لوگوں

Scanned with CamScanner

کو اس پر عمل کرنے کی تحریک دلائی ان کی شخصیت میں کچھ ایسی سحر انگیزی اور زبان میں ایسی جادو بیانی تھی کہ وہ اپنے حریفوں اور مخالفین کی تلخی و نفرت کو پلک جھپکتے ہی غائب کر دیتے تھے کسی بھی انسان میں چاہے اختلاف ،نفرت یا غصہ کتنا بھی شدید کیوں نہ ہو زیادہ وقت تک کے لئے ان سے ناراض نہیں رہ سکتا تھا اور یہی انسانیت اور محبت کا سبق وہ تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بھر دینا چاہتے تھے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی تھے چنانچہ آزادی کی لڑائی میں ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں بلا تفریق رنگ و نسل و مذہب کے سب لوگ شامل ہوتے تھے۔

مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کی بدولت انگریزوں کی غلامی کے خلاف ہندوستان کی جو لڑائی لڑی وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بالکل نئے انداز کی تھی۔ گاندھی جی سے قبل دنیا نہیں جانتی تھی کہ بہادری جان لینے میں نہیں جان دینے میں ہے۔ آپ زندگی کس طرح گزارتے ہیں یہ کمال نہیں ہے بلکہ آپ مرتے کس طرح ہیں اصل کمال یہ ہے۔ بقول شاعر ؎

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سکھا دیا تو نے

مہاتما گاندھی نے بہادری سے جان دینے کا سلیقہ اس شخصیت سے سیکھا جس کے نانا نے جس دین مبین کی تبلیغ کی وہ مساوات کا، عدم تشدد کا علم بردار تھا۔ اسلام کی تعلیمات کو کل بھی عام کرنے کی ضرورت تھی اور آج بھی عام کرنے کی ضرورت ہے۔ سارے ممالک نے اپنی بقا اور آزادی کی لڑائی ہتھیاروں کی طاقت کے زور پر لڑی۔ مہاتما گاندھی نے وہی لڑائی بغیر ہتھیاروں کے لڑی اور انگریز سپاہیوں کے ہاتھوں میں تنی ہوئی سنگینیوں کی نوک خود بخود نیچی ہوگئی اور مجاہدین آزادی خود ہی ہتھیار بن گئے۔

باپائے قوم مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کا جو پرچم بلند کیا آج پوری دنیا اس کی اہمیت کو سمجھ رہی ہے۔ بقول نظیر بنارسی ؎

ترا ارمان پورا ہوگا اے امن و اماں والے
ترے جھنڈے کے نیچے آئیں گے سارے جہاں والے

مہاتما گاندھی کی تفہیم کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے انھیں عام انسان کے بجائے مافوق البشر شخصیت تصور کرکے ان کی پرستش کرنا شروع کر دیا ہے۔ گاندھی جی کی پرستش کے بجائے ان کی شخصیت کی تفہیم گاندھی جی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی زندہ رکھنے کا کام کرے گی۔

گاندھی جی کے اہم کارناموں میں قومی اتحاد، فرقہ وارانہ خیر سگالی، عدم تشدد اور اہنسا کا فلسفہ اس قابل ہے کہ ان پر پوری دیانت داری کے ساتھ آج بھی عمل کیا جائے تو ملک کے اندر اور باہر پنپنے والے تشدد اور عدم برداشت کے ماحول کو ہم دور کرسکتے ہیں۔ گاندھی جی نے ذات، مذہب، علاقائیت، رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ قومی ایکتا کا یہی نظریہ ان کی فکر کا بنیادی پتھر ہے جس پر وہ ایک خوشحال قوم کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کا یہ نظریہ اس قومی روایت پر مبنی معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق پوری کائنات کو اللہ کا کنبہ قرار دیا گیا ہے۔

ہماری اردو زبان کے لئے یہ فخر کا مقام ہے کہ گاندھی جی کو یہ زبان دیگر ہندوستانی زبانوں سے کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ اتنی کہ انھوں نے ذاتی کوشش سے نہ صرف اردو پڑھنا لکھنا سیکھا بلکہ اس کی مشق بھی کرتے رہے۔ اردو سے اس محبت کا ثبوت ان کے وہ سیکڑوں اردو میں لکھے ہوئے خط ہیں جو آج بھی مختلف گاندھی میوزیموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں زیادہ تر خط وہ ہیں جو انھوں نے اپنے رفیقوں سے اردو میں لکھوائے تھے اور اپنے قلم سے ان پر اردو میں صرف دستخط کئے تھے ،لیکن ایسے خط بھی خاصی تعداد میں ہیں جو پورے کے پورے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ گاندھی جی صرف اردو کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ ایک ایسی اردو کو جو فارسی و عربی سے زیادہ بندھی ہوئی نہ ہو اور ایک ایسی ہندی کو جو سنسکرت کے بجائے عام بول چال سے ہم آہنگی رکھتی ہو، آپس میں ملا کر اسے 'ہندوستانی' یا کوئی اور نام دینے اور اسے اردو اور ہندی دونوں کے رسم خط میں قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے حق میں تھے۔ گاندھی جی اردو کے رسم خط کو اپنی مجوزہ زبان کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی کے لئے سب سے بہتر خراج عقیدت یہی ہوسکتا ہے کہ ہم ان کے سب سے مضبوط اور اہم نظریہ 'عدم تشدد' کو فروغ دینے کے لئے پہل کریں اور سکون کا ماحول قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اردو کے مشہور شاعر مجاز لکھنوی نے گاندھی جی کے انتقال پر ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا:

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

□□□

Scanned with CamScanner

تحقیق کا دُرِ شہوار: رشید حسن خاں

ڈاکٹر مجاہد الاسلام

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
رابطہ: 9628845713

رشید حسن کا خان کا نام تحقیق وتدوین کے میدان میں قاضی عبدالودود، حافظ محمود خاں شیرانی اور عبدالستار صدیقی وغیرہم کے ساتھ ساتھ لیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ رسید حسن کا خان کا کارنامہ اس لئے بھی بہت وسیع اور اہم ہے کہ ان کو ایک طویل عمر ملی۔ اس کی وجہ سے جہاں انہوں نے داستان باغ و بہار، فسانہ عجائب مثنوی گلزار نسیم وغیرہ جیسی کئی کتابوں کی تدوین وتہذیب کی وہیں انہوں نے اس فن کے اصول ضوابط اور اس کے متعلقات پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ۔ اردو املا۔ اردو کیسے لکھیں۔ املائے غالب۔ انتخاب مراثی انیس دبیر۔ انتخاب نظیر اکبر آبادی، انشا اور تلفظ۔ تدوین تحقیق روایت۔ تفہیم۔ تلاش تعبیر۔ زبان اور قواعد۔ عبارت کیسے لکھیں وغیرہ کو اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے رشید حسن خان کی ایک حیثیت تنقید نگار کی بھی ہے ترقی پسند تحریک، جوش اور فیض پر ان کے جو مضامین ہیں وہ اردو تنقید کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک مصنف کی زندگی اور اس کی کاوشوں کو سمجھنے میں اس کے خطوط اور آپ بیتی وغیرہ کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ اس کی دیگر تصنیفات کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون 'اردو ادب میں خطوط نگاری کی اہمیت' میں رقمطراز ہیں:

"خطوط کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ معلومات کے اعتبار سے ان میں ایسے نکتے آجاتے ہیں جو تاریخ کی بڑی بڑی جہازی کتابوں میں بھی نہیں ملتے۔ خط نجی حالات کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تہذیبی آثار وکوائف کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ ان میں اپنے زمانے اور ماحول کی تصویریں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔"

(علی گڑھ میگزین: شہریار (ایڈیٹر) سن اشاعت ندارد۔ ص 54)

یہاں پر ہم نے رشید حسن خان کے خطوط سے مترشح چند اہم تحقیقی وتنقیدی نکات کا تجزیہ وتخطیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشہور محقق مالک رام نے قاضی عبدالودود کے بارے میں لکھا ہے:

"قانون شہادت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک کسی شخص کا قصور ثابت نہ ہو جائے وہ بے قصور اور بے گناہ ہے۔ قاضی صاحب کا اصول اس کے برعکس ہے، یعنی وہ اس بنیاد سے شروع کرتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو بے قصور اور بے گناہ نہیں ثابت کرتا وہ قصوروار مجرم ہے۔"

رشید حسن خان کا اصول تدوین و تحقیق بھی قاضی عبدالودود، حافظ محمود خاں شیرانی اور عبدالستار صدیقی سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

تنقید و تحقیق میں ایک چیز جو بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ چاہے وہ محقق ہو یا تنقید نگار اس فن میں اس کا موقف بہت ہی زیادہ صاف، واضح اور دوٹوک ہونا چاہیے، اور یہ چیز ہر جگہ رشید حسن خان کی تحریر سے مترشح ہے۔ اس سے ان کے خطوط بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، انہیں آل احمد سرور کا دورخا پن پسند نہیں۔ سرور صاحب ایک ہی بات کو ایک وقت میں 'ہاں' اور دوسرے وقت میں 'نا' کہتے ہیں۔ وہ سلمان احمد رباب رشیدی کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے بہت سے احباب کو مجھ سے دو شکایتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میرے لہجے میں 'وہ قلم کا ہو یا زبان کا' تلوار کی دھار ہے، وہ لوچ نہیں جو منافق آدمی کی بات میں ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے منفعل ہونا نہیں آتا۔ مجھے ہمیشہ اس کا اعتراف رہا کہ میرے لہجے میں واقعی وہ تہ داری اور غدوبت نہیں جس سے گفتگو میں یا تحریر میں، ایسا دورخا پن پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر شخص بقدر ذوق وظرف اس کی مناسب تاویل کر سکے، دوسرے لفظوں میں مجھے اس کا اقرار ہے کہ میری گفتگو یا تحریر، سرور صاحب کی تنقید نہیں بن سکی، جس میں آخر تک 'ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے' والی کاریگری کارفرما ہو۔ اور مجھے اس سے پہلے بھی معذرت طلب ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئی، نہ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(رشید حسن خان کے خطوط (پہلی جلد): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن 2011 ص 631)

سلمان احمد رباب رشیدی کو ہی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"رہی بدنامی، وہ پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی، اس کا غم نہ کرو، میں ان چیزوں کی طرف توجہ مطلق نہیں دیتا۔ ان لوگوں کی تعریف یا مذمت، دونوں بے معنی چیزیں ہیں۔ مجھے ان دونوں سے مطلق تعلق خاطر نہیں۔ میں جس چیز کو بجائے خود صحیح سمجھتا ہوں، اسے ضرور کرتا ہوں اور اس سے قطعاً غرض نہیں رکھتا کہ دوسروں کا ردعمل کیا ہوگا، وہ دوسرے کس قماش اور کس سطح کے لوگ ہوں۔ مجھے نہ کسی سے کچھ لینا ہے اور نہ دینا، اس لئے تحسین یا نفری میرے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ پبلک ریلیشن کا میں کبھی قائل نہیں رہا اور نہ ہونگا۔

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن 2011 ص 596)

اسی طرح کی باتیں انہوں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو بھی اپنے ایک خط میں لکھی ہیں:

"32 سال تک جس شعبے میں کام کیا، اب اس کے لئے قطعی طور اجنبی ہوں، وجہ صرف یہ کہ جاہلوں کی ستائش نہیں کر سکا اور نہیں اقبال شناس نہیں مان سکا۔ اور اس کا اظہار بھی برملا کرتا رہا۔ ایسے اظہار کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے، کیا کیا جائے تقیہ کرنا میرا شیوہ نہیں اور قبول عام سے ہمیشہ نفور رہا ہوں۔ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہہ سکا۔ (رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن ص 288)

اسی طرح اگر وہ کسی شخص میں کوئی قابل تعریف چیز دیکھتے ہیں تو اس کا جم کر اعتراف بھی کرتے ہیں:

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کو لکھتے ہیں:

"عرشی صاحب واقعی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ نے جس مضمون کے بارے میں رائے ظاہر کی ہے وہ کون سا ہے؟ ان کے متعلق میری رائے بہت اچھی ہے، ویسے خامیوں سے مطلقاً پاک صرف خدا کی ذات ہے (اعتقاد گو) عرشی صاحب نے جو کام کئے ہیں، وہ واقعتاً اعلیٰ پائے کے ہیں۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (حصہ اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن 2011 ص 442)

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کو لکھتے ہیں:

"تنویر علوی صاحب کے یہاں ایک دن آپ کا مرتبہ دیوان دیکھا تھا

Scanned with CamScanner

۔بلامبالغہ عرض کروں کہ میں انداز ترتیب سے متاثر ہوا اور بہت زیادہ۔آپ نے بالکل نیا اور نہایت درجہ مفید انداز اختیار کیا ہے ۔اس کی افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے اچھے کام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اور میں اپنے آپ کو اس کی تعریف پہ مجبور پاتا ہوں۔اس مفید اور اچھے کام پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص877)

اسی طرح وہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو لکھتے ہیں:

''اور ہاں 'میر انیس اور علامہ اقبال 'والے مضمون میں یہ جملہ پڑھ کر دیر تک وجد کا عالم طاری رہا:'لکھنؤ کے خوش مزاج اس اعتبار سے بے نصیب رہے کہ وہ مرثیہ کے مثالی کرداروں سے رونے کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔'واہ سبحان اللہ !اور'خوش مزاج' کی بلیغ معنویت بھی داد سے مستغنی ہے۔

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص420)

یوں تو جلد بازی کا کیا گیا کوئی بھی کام اچھا نہیں ہوتا ہے۔فن تحقیق کے بارے میں رشید حسن خان کا خیال ہے کہ جب تک موضوع سے متعلق تمام ہی مواد ومٹریل اکٹھا نہ ہو جائے کام شروع نہیں کرنا چاہیے۔ان کا خیال ہے کہ طلب صادق ہو تو ہر معاملہ بحسن خوبی انجام پاجاتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں پروفیسر نیّر مسعود کو لکھتے ہیں:

''نیّر صاحب میرا تجربہ یہ کہ باغ و بہار،فسانۂ عجائب ،گلزار نسیم اور اب یہ مثنویاں،ان سب کے نتیجے میں کہ لگن سچی ہو اور آدمی پوچھنے میں شرم نہ کرے اچھے طالب علم کی طرح،اور یہ کہ صبر توفیق رفیق رہے،تو ہر نسخہ مل جاتا ہے اور ہر کام ہو جاتا ہے،یہ جو کہا جاتا کہ فلاں چیز ملی نہیں،اس میں اکثر کم توجہی کو دخل ہوتا ہے یا پھر اس کو کہ طلب صادق نہیں ہوتی اور آدمی کام کو جلد تر کرنا بلکہ بھگتنا چاہتا ہے۔میں نے باغ و بہار کے سلسلے میں ہندی مینول کی تلاش میں مکمل بیس سال صبر کیا اور تلاش کرتا رہا۔آخر کار مل گیا،جب کہ سب کو اس کا یقین آچکا تھا کہ وہ ناپید ہو چکا ہے۔جب تک وہ مل نہیں گیا۔باغ و بہار کے متن کو مرتب نہیں کیا۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص997)

رشید حسن خان نے 'امراؤ جان ادا' ناول کو اس لئے مرتب نہیں کیا کہ اس پہلا نسخہ انہیں دستیاب نہ ہو سکا۔اور فسانۂ عجائب کی تدوین کے سلسلے میں بھی سن لیجیے اس کی تصحیح و تدوین اور کتابت مکمل ہو چکی تھی کہ اچانک ان اس کتاب کا ایک ایسا نسخہ ان کے ہاتھ لگا جس میں کہ سرور نے خود اپنے ہاتھ سے ترمیمیں و تبدیلیاں کی تھیں۔خاں صاحب نے مسودے کے پہلے سے کتابت شدہ تمام ہی اوراق کو ضائع کر دیا اور پھر سے نئے نسخے کے مطابق کتابت کروائی۔اس ذیل وہ معروف محقق ڈاکٹر حنیف نقوی کو لکھتے ہیں:

''اب میری داستان پریشانی بھی سن لیجیے :فسانۂ عجائب کی کتابت اور تصحیح مکمل ہو چکی تھی۔یہ ڈیڑھ سال سے زیادہ محنت کی کمائی تھی۔پٹنے جو گیا تو وہاں ایک نیا مطبوعہ نسخہ ملا ،۱۲۸۰ھ کا۔اب تک ہم سب کا خیال یہ تھا کہ آخری نسخہ ۱۲۷۶ھ کا ہے مطبع افضل المطابع کانپور کا۔یہ بھی اسی مطبعے کا ہے لیکن گویا اس مطبعے سے دوبارہ چار سال کے بعد چھپا ہے اور اسی اشاعت میں سرورؔ نے جی بھر کے ترمیمیں اور تبدیلیاں کی ہیں اس طرح وہ ساری کتابت بیکار گئی ۔میں یہ آسانی یہ لکھ سکتا تھا کہ کام کی تکمیل کے بعد فلاں نسخہ ملا ،لیکن یہ ایمان داری اور اصول،دونوں کے خلاف ہوتا۔طبیعت کو یہ بے ایمانی گوارا نہ ہو پائی اور اس سارے کام کو کالعدم قرار دے کر،اب از سرنو پرسوں سے اس کام کو شروع کیا ہے ۔سخت کوفت ہوئی لیکن یہ اطمینان بھی ہوا کہ اب اصول تدوین کے مطابق کام ہوگا اور یہ متن گویا قابل اعتبار ہوگا۔تعجب اس پر ہے کہ اس نسخے کا حال اب تک معلوم نہیں ہو پایا تھا ۔،اگرچہ مطبوعہ ہے ۔دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں،مجھے یقین ہے کہ آپ اس پریشانی کو گوارا کرنے پر ضرور مطمئن ہونگے اور ایسے ہی چند اور حضرات ہونگے اور میں سب کے لئے نہیں،ایسے ہی چند حضرات کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں ۔جلدی کا میں قائل

Scanned with CamScanner

نہیں۔جب چھپے کا چھپ جائے گا۔البتہ سارے کئے کام کو از سر نو مرتب کرنے میں اور از سر نو حواشی لکھنے میں اور اختلاف نسخ تیار کرنے میں الجھن ضرور ہے اور بہت ہے۔لیکن یہ ناگزیر ہے ،اس کا شکوہ کیا۔پچھلے دو تین ہفتے اسی ناگزیر الجھن میں گزرے ہیں۔''

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص326)

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ رشید حسن خان نے'امراؤ جان ادا' ناول کو اس لئے مرتب نہیں کیا کہ اس پہلا نسخہ انہیں دستیاب نہیں ہوا۔اسی طرح انہیں حوالے کے لئے 'معرکۂ چکبست' کے پہلے ایڈیشن کی ضرورت تھی ۔اگر چہ ان کے پاس اس کتاب کا کوئی دوسرا ایڈیشن ضرور موجود تھا مگر وہ اس کو ناکافی سمجھتے تھے۔چنانچہ جب اس پہلے نسخے کا سالک لکھنوی کے پاس موجود ہونے کا پتہ چلا تو ان کو لکھتے ہیں:

''آپ نے از راہ لطف خاص معرکۂ چکبست وشرر کے پہلے اڈیشن کا ذکر کیا ہے ،میرے پاس کا موخر اڈیشن ہے، پہلا اڈیشن مجھے نہیں ملا۔تحقیق کے جو اصول ہیں ان کی رو سے اشاعت اول کا حوالہ دینا انسب ہے۔اگر آپ اپنے انداز کریمانہ کے تحت اس کا موقع فراہم کردیں گے کہ میں اسی اولین اشاعت سے عبارتیں نقل کرسکوں ،تو یہ بڑی بات ہوگی ۔میرا خیال ہے کہ میں سال بھر کے اندر اس کام کو مکمل کرلوں گا اور مکمل کرتے ہی اس نسخے کو بہ احتیاط تمام واپس کردونگا اس کا میں وعدہ کرتا ہوں ۔میں اپنے محترم سے پھر عرض کروں کہ وہ نسخہ وہاں موجود ہے آپ کے خاص التفات کے بغیر مجھے اس کا عکس کسی طرح نہیں مل سکتا۔

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص555)

آج کے محققین پر وہ جلد بازی کا الزام لگاتے ہیں۔جس کی وجہ سے کام آدھا ادھورا ،ناقص رہ جاتا ہے ۔پروفیسر شاہ عبدالسلام کے انداز تحقیق وتدوین کی خامیوں کو کئی جگہوں پر اجاگر کیا ہے۔وہ ایک جگہ شاہ عبدالسلام صاحب کے مرتبہ کلیات شوق کے کے بارے میں مسعود رضوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں ان دنوں شاہ عبدالسلام کے مرتبہ کلیات شوق کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کام تو قاعدے سے کئے جاسکنے کا مستحق تھا۔شاہ صاحب نے اسے اس طرح انجام دیا جیسے چونی طوائف کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص994)

اسی طرح اپنے ایک اور خط میں اس طرح کے رویے پر وہ نیر مسعود رضوی کو لکھے اپنے ایک میں شاہ عبد السلام اور محمد حسن کو ایک ساتھ نشانہ بناتے ہیں:

''ہر شخص ڈاکٹر محمد حسن اور شاہ عبد السلام بن گیا ہے۔کہاں کا صبر اور کہاں کی تلاش اور کاہے کی لگن ۔کام ایسے کرو جیسے چونی مار کارنڈی کے ساتھ برا کام کیا جاتا ہے اور بقول نظیر: ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا ،خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔اگر ڈیرے دار طوائف ان کے زمانے میں ہوتی تو یہ لوگ اور ایسے لوگ تو اس کے ساتھ جنسی روابط کے آداب کی بھی تاب نہیں لاسکتے تھے۔یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ اس زمانے میں کارفرما ہیں جبکہ ہر طرف 'طفلان بے تہ' کا دور دورہ ہے اور خفیف الحرکاتی نے معیار کا عنوان اختیار کرلیا ہے،دلی کے کرخندار غصے میں آکر نئے کاریگر سے کہتا ہے:۔۔۔۔۔پکڑنے کا ڈھنگ آیا نہیں اور۔۔۔۔کی فہرست میں نام لکھانے چلے آئے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص998)

کوئی مطلوبہ چیز جب انتظار بسیار کے بعد ایک محقق کو ہاتھ لگتی ہے تو اس کو کس قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ان کے خطوط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے محسوس کی جاسکتی ہے۔نیر مسعود رضوی کو ہی لکھتے ہیں:

''کل ایک خط حوالۂ ڈاک کیا تھا،صبح کے وقت جس میں یہ شکوہ بھی درج تھا کہ بہار عشق کا ۱۲۶۸ھ کا اڈیشن نہیں ملا اور شاید ملے گا بھی نہیں ۔شام کو چار بجے ایک قاصد فرخندہ سیر،خوش خبر،ایک پیکٹ لایا،جس میں فریب عشق ،بہار عشق اور زہر عشق کے چھ

مختلف اڈیشن ملفوف تھے بہ شمول بہار عشق نسخہ ۱۲۶۸ھ، بیان نہیں کر سکتا کہ کیسی مسرت ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔سوچا آپ کو بھی اس مسرت میں شریک کروں، اشاعت اول سے رات و رات جو مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ شاعر نے اشاعت اول پر باضابطہ نظر ثانی کی ہے اور متعدد اشعار کا اضافہ کیا ہے آخر کے عشق حقیقی والے اشعار کے علاوہ۔اگر یہ نسخہ نہ ملتا تو میرا کام ادھورا رہتا۔ایک نسخہ مطبع علوی علی بخش خاں کا بھی ہے ۱۲۷۷ھ کا۔نول کشوری نسخے بھی ہیں 1871 کے (وغیرہ)اب معلوم ہوا کہ آپ کے شاہ صاحب نے بہت گڑبڑ کی ہے اپنے نسخے میں۔خوب ہیں یہ لوگ بھی۔

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص997)

کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ کی طرف سے تیار شدہ تاریخ ادب اردو پر جب رشید حسن خان کا تبصرہ چھپا تو علی گڑھ کے حل وعقد نے بک سلروں تک کے پاس سے اس کتاب کے نسخوں کو اٹھوالیا تھا۔اس ذیل میں وہ گیان چند جین کو لکھتے ہیں:

"اب ایک خاص بات:علی گڑھ تاریخ ادب کے سلسلے میں جس قول کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ قطعی طور پر صحیح نہیں ہے۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ڈاکٹر اشفاق محمد خاں شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔وہ اس زمانے میں یونیورسٹی کے دفتر میں اس سکشن کے انچارج تھے،جہاں V.C کا وہ آرڈر آیا تھا کہ کتابیں بازار سے اٹھالی جائیں اور فروخت بند کردی جائے۔اس آرڈر کو خود انہی نے وصول کیا تھا اور اس پر عملدرآمد کرایا تھا اور کیا تھا۔میں نے بذات خود یونیورسٹی جاکر سب کے سامنے ان سے صورت حال معلوم کی اور انہوں نے یہ ساری تفصیلات بتائیں۔اگر آپ کہیں گے تو میں ان سے تحریری بیان بھجوادونگا۔اصل میں یہ اس تبصرے کی اہمیت کو کم کرنے کی ایک کوشش تھی۔یوں کہ یہ تاریخی بات ہے کہ ایک تبصرے کی بناپر اتنی بڑی اسکیم کی کتاب باضابطہ واپس لے لی جائے۔اس کی کوئی دوسری مثال اردو میں تو ہے نہیں۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو اصل بات کو برقرار رکھیں یا پھر اس جھگڑے کو ہی بیچ سے نکال دیں۔اس تبصرے کی اہمیت تو بہر طور سب کے سامنے ہے۔ہاں: سردار علی جعفری کی مرتبہ رباعیاں اور جمیل جالبی کی تاریخ ادب والے تبصرے اور ثقافت پاکستان کے تبصرے بھی توجہ طلب ہیں۔"

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص796)

گیان چند ہی کو اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

"اور ہاں کیا سرورؔ صاحب کو تاریخ ادب کے مرتب کا منصب قبول کرنا چاہیے تھا؟وہ نقاد ہیں،تحقیق کی ان کو دور سے بھی مناسبت نہیں،ستم بالائے ستم یہ کہ نائب تھے مجنوں صاحب۔خود سرور صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ طرح طرح کی ذمہ داریوں میں وہ پھنسے ہوئے تھے تو کیا ایمان داری کا یہی تقاضا تھا کہ اتنے بڑے منصوبے کی ذمہ داری کو بھی قبول کرلیا جاتا۔میں اسے بہت بڑی بے ایمانی سمجھتا ہوں۔اتنا روپیہ اب کبھی تاریخ ادب کے لئے نہیں ملے گا،غضب یہ کہ یار لوگوں نے جو اقتباسات پیش کئے،ان کے متن کی تصحیح ضروری نہیں سمجھی۔اس پر ان کا 'دل سوزی کے ساتھ لکھنا' یعنی میرے تبصرے کی شکایت کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔اور پھر انہوں نے لکھا کیا ہے،یہ لکھا ہے کہ کچھ اغلاط طباعت تھیں جن کو نمایاں کیا گیا تھا۔جھوٹ بولنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے"۔

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج ،نئی دہلی۔سن 2011 ص797)

اس ذیل میں کمیٹی کے صدر آل احمد سرور نے اپنی آپ بیتی 'خواب باقی ہیں' میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بھی بڑے خاصے کی چیز ہے۔سرور صاحب نے سب سے پہلی بات جو لکھی ہے وہ یہ اس کتاب میں کچھ طباعت کی خامیاں اور اشاریے کی خامیاں رہ گئی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے بک سلروں سے کتاب واپس منگوالی یعنی اس کی فروخت بند کروادی اور یہ کہ یہ آرڈر انہوں نے خود جاری کیا نہ کہ اس وقت کے وائس چانسلر نے۔انہوں نے اس بات پر کڑے لفظوں میں اظہار افسوس بھی کیا ہے کہ رشید حسن خان کی تخریبی تنقید کی وجہ سے یو جی سی نے اس پروجیکٹ کو ہی بند کردیا۔اور اس کے لئے مزید

رقم جاری نہیں کی۔

اسی طرح رشید حسن خان اپنے ایک خط میں جمیل جالبی پر جلد بازی اور دنیا طلبی کا الزام لگاتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''ادبی دنیا میں اس وقت یہ عجب صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ ہمارے بعض معروف افراد آسان پسندی کے پھیر میں آ گئے ہیں اور دنیا طلبی کی دور میں شامل ہو گئے ہیں۔ آخر نئے کام کرنے والوں کے سامنے ہم کس قسم کی مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں؟ جمیل جالبی صاحب کی تاریخ اب دہلی میں بھی چھپ گئی ہے اور کسی اور کتاب کی عدم موجودگی میں عموماً اسی سے استفادہ کیا جائے گا۔ لوگ مختلف وجوہ سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں بغیر اس کو پڑھے ہوئے ۔جب کہ اس کے مندرجات کا احوال عجیب بل کہ عجیب تر مثلاً مولف کے نزدیک عہد تغلق میں اردو زبان موجود تھی اور بین الاقوامی بن چکی تھی ۔اورنگ زیب کے زمانے میں ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی ۔شاہجہاں کے عہد میں سرکاری ملازمت کے لئے اردو جاننا لازم تھا اور شاہجہاں خود بھی اردو لکھا کرتا تھا۔ امیر خسرو نے خسرو خاں کی جنگ کے حالات اصلاً پنجابی زبان میں لکھے تھے ان کے نزدیک فارسی عربی الفاظ ،اسلامی زبانوں کے لفظ ہیں اور 'مسلمانوں کے لفظ' ہیں اور اردو اس طرح بنی کہ 'اسلامی زبانوں' کے ہزار ہا لفظ مقامی زبانوں میں داخل ہونے لگے۔ غرض یہ کہ اس طرح کے عجائبات کی کان ہے یہ کتاب۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کس طرح سے چپ رہا جائے !اگر تبصرہ کیا جائے اور صحیح بات کہی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ نکتہ چینی ہے۔ تخریب ہے تنقیص ہے۔ زور صاحب کی بھی کتاب کا احوال یہی تھا اور یہی صورت تھی علی گڑھ تاریخ ادب کی ۔بالکل یہی عالم تھا دیوان غالب صدی اڈیشن کا ۔مرتب نے غصب یہ کیا کہ اصول تدوین کی طرف کم توجہ کی۔ حد یہ کہ جس نسخے پر ادب کی بنیاد رکھی ۔اسے بہ چشم خود دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا ۔۔تذکیر و تانیث ،صحت املا ،املائے مصنف ،صحت وزن ۔غرض ضروری امور کی طرف سے بے حد بے پروائی برتی گئی ۔یہی بات اس تبصرے کی محرک ہوئی ۔وہ میرے محترم ہیں مگر افسوس کی بات یہ کہ کثرت تالیف کے پھیر میں آ کر معیار کی طرف سے انھوں نے قطع نظر کو روا رکھا ہے ۔اب یہ آپ کے اوپر ہے کہ اسے تخریب کہیے یا تنقیص ،میں بجائے خود اسے ایک ضرورت سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی فرد یا ادارے کی چھٹائی یا بڑائی پر نظر نہیں کی ،اپنی بساط بھر صحیح بات کہتا رہا اور اس کے نتیجے میں ساری دنیا سے گویا تعلقات خراب ہو گئے اور اس کے نتائج اب بھی بھگت رہا ہوں مگر خدا کا شکر کہ پشیمان نہیں اور اپنے نقصانات پر افسوس ضرور ہے مگر یہ احساس ہے کہ اس راہ میں یہی ہوتا ہے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (حصہ اول) :مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج ،نئی دہلی۔ سن 2011 ص 766)

یہی کچھ رشید حسن خان نے پاکستان میں تیار اردو لغت کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

اسی طرح کے رویے پر رشید حسن خان نے خواجہ احمد فاروقی کو بھی نشانہ بنایا ہے ان خیال تھا خواجہ صاحب کو اسکی مطلق پرواہ نہیں کہ کون سا کام کس پائے کا ہے ان کو بس اس سے مطلب ہوتا تھا کہ اس کو بس شائع ہونا چاہیے 'اشارۂ کلام غالبؔ' کے بارے وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جس کتاب کا نام آپ نے پوچھا ہے، اس کا نام ہے 'اشارۂ کلام غالبؔ' یہ عرض کردوں کہ یہ مرحوم فاروقی صاحب کا کرایا ہوا کام تھا اور ان کے کرائے ہوئے سارے کام ساقط المعیار ہیں، یہ بھی ویسا ہی ہے۔ انہوں نے صدر کی طاقت سے کام لے کر آخر میں میرا نام بھی دو دوسرے ناموں کے ساتھ لکھ دیا تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا، بگر میرا حصہ دور کا جلوہ ہے اور بس۔ اس کے اندراجات سے میں ذرا بھی مطمئن نہیں اور نہ ماخذ سے، ہاں یہ خواہش ضرور تھی کہ اس کام کو میں اپنے انداز سے کرسکتا۔ کبھی کروں گا ضرور مگر وہ وقت کبھی کب آئے گا ،یہ معلوم نہیں''۔(

رشید حسن خان کے خطوط، حصہ اول: مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔ رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج ،نئی دہلی۔ سن 2011 ص۔716)

یہی کچھ خیال رشید حسن خان کا 'کربل کتھا' کی اس شاعت کے بارے میں بھی ہے جو خواجہ احمد فاروقی کی ہی نگرانی میں شعبہ اردو ،دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس ذیل میں وہ لکھتے ہیں

''کربل کتھا' سے میرا تعلق اس کے

Scanned with CamScanner

سوا کچھ نہیں کہ پریس سے جب پروف آیا تو اس کو ایک نظر ضرور دیکھا تھا۔ چونکہ معلوم تھا کہ فاروقی صاحب ایک خاص تاریخ تک اس کو بہ ہر صورت چھاپنا چاہتے ہیں، یوں کچھ کہنا بیکار تھا۔ تذکرہ سرور کے سلسلے میں کئی صفحوں پر مشتمل ایک یادداشت میں نے دی تھی۔ یہ اس کے بعد کی بات ہے۔ اس میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اس کی طباعت شعبے کے لئے باعث بدنامی و رسوائی ہوگی، مگر وہاں بھی وہی بات تھی کہ تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور اس وقت تک کسی بھی صورت میں کتاب چھپنا ضروری تھا۔ فاروقی صاحب کو معیار سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ان کی دلچسپیوں کے مراکز دوسرے ہوتے تھے۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن ص885)

اسی طرح رشید حسن خان قدیم و جدید مرثیہ میں فرق کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک سوال میرے ذہن میں یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ جن مراثی کا آپ نے حوالہ دیا ہے اور ان سے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، گو یہ نئے مرثیے نئے سماجی احساس سے خالی نہیں، پھر ان میں وہ طاقتور تاثر کیوں نہیں جو ان پرانے مراثی کی خاص صفت ہے۔ جو مثالیں آپ نے دی ہیں، وہ بھی خاصی بے رنگ ہیں۔ کیا یہ محض عہد کا مسئلہ ہے یا اس میں یہ بھی پنہاں ہے کہ یہ خاص صنف اپنے امکانات سے آخری حد تک کام لے چکی ہے اور اب اس میں بقدر شوق والی وسعت نہیں۔ جوش کو چھوڑیے، کہ ان کی شاعری پر تو گرجتے برسنے والا انداز حاوی رہتا ہے، وہ کچھ بھی کہیں، اور یہ تاثر دشمن انداز ہے۔ دوسرے نئے شعراء کے نئے مراثی میں آخر وہ جاذبیت، دلکشی اور شعری محاسن کیوں نہیں، جو انیس کا حصہ ہیں۔ زبان و بیان میں وہ حسن کیوں نہیں کہ آدمی کچھ دیر کے لئے اسی میں کھو جائے۔ یہ سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ مثلاً ص 109 پر صفدر کے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، وہ حسن بیان سے بڑی حد تک خالی ہیں۔ تیغ کا تھرک کے ناز سے قضا پر جانا یا کڑک کے سن سے چلی، یہ کڑک اور سن سے چلنا کا اتصال، کیا میر انیسؔ اس طرح لکھ سکتے تھے؟"

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن 2011 ص854)

اقلیت کی نفسیات پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ہی کسی مہاراتھی نے کیا ہو۔ رشید حسن خان خط ملاحظہ ہو:

"متعدد لوگوں نے مجھ سے نیر صاحب کے لب و لہجے کی شکایت کی ہے۔ انھوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ علمی مسائل تبرائی زبان میں زیر گفتگو نہیں آسکتے۔ آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجئے، کوئی دہلی والا برا نہیں مانے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ دہلی کی تہذیب کو برا کہا جا رہا ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیر الدین حیدر یا واجد علی شاہ) کی واقعی خامیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور پوری شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ وہی اقلیت کی نفسیات ہے، جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر مبتلا رہتی ہیں۔"

(رشید حسن خان کے خطوط: مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا۔ اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ سن 2011 ص۔660)

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے نام ایک خط میں 'بلبل' کی تذکیر و تانیث پر رشید حسن خان کی یہ موشگافیاں دیکھیں:

"کل الہام ہوا ہے دنوں کے بعد، آپ بھی سن لیجئے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ سوداؔ سے پوچھا گیا کہ بلبل مذکر ہے یا مونث، انہوں نے کہا کہ یہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ اس پر آزاد نے لفظ 'بلبل' پر حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے 'اب تو ڈبل تانیث ہو گئی، اب بھی مونث نہ ہوگی' برسوں غور کیا، آزاد کا قول سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر ڈبل تانیث سے کیا مراد ہے۔ اچانک الہام ہوا کہ اردو میں لام اور رے کا ابدال ہوتا ہے جیسے دیوار، دیوال، تلوار، تروار (وغیرہ) آزاد کی مراد یہ کہ اس لفظ 'بلبل' میں بھی یہی ہوا ہے پہلے دونوں جگہ رے تھی وہ لام سے بدل گئی۔ بل بل۔ اب یاد آیا پرانی کتابوں میں 'بل مرائی' آیا ہے۔ یوں ڈبل تانیث ہوئی۔ یار! یہ آزاد تو واقعی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ گالی دینے کا جیسا سلیقہ اس شخص کو ملا تھا وہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ آپ کسی لسانی ------- سے 'آب حیات' کے اس مقام کو پوچھ کر دیکھیے اس کا اپنا مقام بدل جائے بگڑ جائے مگر بات سمجھ میں نہ

Scanned with CamScanner

آئے گی۔ذرا پوچھیے گا! یہ خط اشفاق محمد خاں صاحب کو بھی پڑھا دیجئے گا۔اسلم بھائی کہاں ہیں۔دو بار ان کے گھر گیا۔نہیں ملے ان سے سلام کہیے۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم): مرتبہ: ٹی آر رینا۔ص۔رشید حسن خان کے خطوط: مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص283)

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے نام ہی ایک خط میں 'لفظ' گلشن میں ایہام تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"احمد ندیم قاسمی کا ایک طویل مضمون آیا تھا فیض سے متعلق، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک محفل میں فیض صاحب سے میں نے کہا کہ گلشن نام کی ایک طوائف نے فلاں علاقے میں مکان کرایے پر لیا ہے اور باہر بورڈ پر آپ کا یہ مصرع لکھ کر لگا دیا ہے: چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔احمد ندیم قاسمی (غالباً) ترقی پسند تھے اور ہیں۔ہم کچھ کہیں تو برادر عزیز از جان قمر صاحب کا دست پروردہ ایک ولد الحیض نطفۂ دوپہری، چوتیا یا نخس، مفعول مطلق کہے کہ رشید صاحب تو تنقیص کرتے ہیں، اب کیا کہا جائے گا۔"

(رشید حسن خاں کے خطوط (دوسری جلد) رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص387)

رشید خان نے اپنے خطوں میں دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ماہر لسانیات میں اس بات کو لے کر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اردو میں دیگر زبانوں جیسے عربی، فارسی، ہندی کے دخیل الفاظ کا محل استعمال، املا، تلفظ خود ان زبانوں کے مطابق کیا جائے گا یا پھر مدخل زبان کے مطابق۔اس ذیل میں رشید حسن خاں امیش بہادر شریواستوا فگار اناوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مشکور جیسے الفاظ اب اردو زبان کے لفظ ہیں۔ان کو اردو میں چلن کے مطابق ماننا لازم ہے۔جب عربی لکھیں گے، تب عربی قواعد کی پابندی کی جائے گی۔الفاظ کا احوال افراد جیسا ہوتا ہے۔فرد جب ہجرت کر کے کسی نئے ملک میں جا بستا ہے تو اس پر اس نئے ملک کے قوانین کا نفاذ ہوتا ہے۔وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے ملک میں تو ایسا نہیں تھا۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن 2011 ص283)

اسی طرح وہ ڈاکٹر ٹی آر رینا کو لکھتے ہیں:

"لفظوں کا حال اشخاص جیسا ہوتا ہے، ویسی ہی شخصیت، ویسی ہی صفات اور ویسی ہی صلاحیتیں۔جب ایک زبان سے دوسرے میں الفاظ منتقل ہوتے ہیں (اور یہ عمل مسلسل ہے، جاری رہتا ہے) تو ان کا احوال ان مہاجرین جیسا ہوتا ہے جو نقل وطن کر کے کسی اور ملک میں آباد ہو جاتے ہیں۔ان مہاجرین پر قاعدے قانون تو اسی نئے ملک کے جاری ہوتے ہیں، مگر اس کی شکل صورت نہیں بدلتی، صرف طور طریقے بدلتے ہیں، اسی طرح ایسے مہاجر لفظوں کا تلفظ بدلتا ہے، معنی بھی بدل سکتے ہیں، ان میں اضافہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، مگر ان کی صورت، یعنی املا اسی طرح نہیں بدلتا۔اگر بعض تبدیلیاں ہوتی ہیں تو وہ ضمنی نوعیت کی ہوتی ہیں۔عربی سے جو لفظ آئے وہ اپنے حرف تہجی کو، یعنی اپنے املا کو ساتھ لے کر آئے، ث، ص، ض، ظ، ع، غ ایسی ہی آوازیں ہیں اس لئے وہ نہیں بدلیں، بدل بھی نہیں سکتیں۔اب یوں دیکھو کہ ہندی کی ہکارہ آوازیں اردو میں آ گئیں۔مگر اردو میں رھ، مھ، نھ، اس کی اپنی ہکارہ آوازیں ہیں، جو ہندی میں نہیں، ہندی والا کلہاڑی لکھے گا، مگر اردو میں کلھاڑی ہے۔بات وہی کہ لھ کی آواز اردو میں ہے ہندی میں نہیں"۔

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد اول): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن 2011 ص-297)

اسی طرح وہ احتشام حسین ندوی کو لکھتے ہیں:

"عربی کے الفاظ و تراکیب اسی طرح صحیح ہیں جس طرح وہ اردو میں رائج ہیں۔عربی یا فارسی میں ان کی صورت کیا ہے، یہ الگ بحث ہے۔اردو کے ماہرین لسان اور ماہرین لسانیات اس پر اتفاق پر کہ جو لفظ اردو میں آیا، وہ اردو کا ہو گیا۔اب اس کی صحیح صورت وہی ہے جس طرح وہ اردو میں مستعمل ہے"۔

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم)

Scanned with CamScanner

:مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج،نئی دہلی۔سن ص۔62)

ہر مصنف کی سبھی تصانیف یکساں نہیں ہوتی ہیں،اور نہ سبھی تصانیف اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کو طباعت کے زیور سے مزین کیا جائے۔جیسا کہ اہل اردو جانتے ہیں کہ گیان چند جین اردو کے ایک ممتاز محقق اور اسکالر ہیں۔رشید حسن خان ان کو انہی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس دن آپ کا خط ملا،اسی دن تنویر علوی صاحب نے 'ذکر وفکر' کا ایک نسخہ دیا اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں۔میرا پچھلا خط آپ کومل چکا ہوگا۔میں نے کتاب کو از اول تا آخر پڑھ ڈالا۔چونکہ آپ کی عنایت میرے شامل حال رہی ہے،اس لئے یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس مجموعے میں ناہمواری بہت ہے بہ لحاظ مضامین وموضوعات۔میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اس باب میں متفق ہونگے ہم دن بھر جتنی باتیں کرتے ہیں،وہ سب درج رجسٹر ہونے کے لائق نہیں ہوتیں،یہی احوال تحریروں کا بھی ہے،بہت سے اخباری تبصرے اور ریڈیائی نشریے ایسے ہوتے ہیں جو کسی اچھے مجموعے کے اجزاء بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔اب یہ تو کیا کہوں کہ ہر طرح کی تحریریں معرض وجود ہی میں کیوں آئیں۔ہم سب کو اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے اور یہ ایسی مجبوری ہے جس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو پایا ہے،مگر انھیں مجموعے میں کیوں شامل کیا جائے؟ ہر تحریر اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ زندہ رہے یا اسے وہ درجہ دیا جائے جو اہم مقالوں کا ہوتا ہے۔آپ اس قدر اچھی تحریریں لکھ چکے ہیں اور ایسے پر مغز مقالے تحریر کر چکے ہیں کہ اب ایسی پھسکر تحریروں کا انتساب آپ سے اچھا نہیں معلوم ہوتا جن کو ادبی حیثیت یا اہمیت کم اور کم تر ہو۔ایسی کم تر تحریریں یہ تاثر بھی پیدا کرسکتی ہیں کہ جیسے اب لکھنے کے لئے کچھ اور باقی نہیں رہا ہے۔

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد دوم):مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج،نئی دہلی۔سن 2016 ص۔ 563)

ایک اچھی تحقیق صرف اپنے لغوی یا اصلاحی معنی تک ہی محدود نہیں ہوتی ہے بلکہ اور بہت سے علوم ہیں جن کا ان سے تعلق ہوتا ہے اس طرح سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک اچھی تحقیق کے بہت سارے لوازمات ہوتے ہیں جن کا علم ایک محقق کے لئے لازمی ہے انہی میں سے ایک عروض بھی ہے۔عروض پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبید اعظمی ممبئی کے نام اپنے ایک خط میں رشید حسن خان لکھتے ہیں:

''عروض میری مجبوری رہا ہے،دلچسپی کی چیز کبھی نہیں بن سکا۔یہ قطعی طور پر درست نہیں کہ شاعر کے لئے عروض جاننا ضروری ہے۔موزونی طبع اصل چیز ہے جو لوگ اشعار میں عروضی اینچ پینچ کے کرشمے دکھاتے ہیں (ایسے بعض حضرات موجود ہیں)ان کے ایسے اشعار عموماً شعریت سے معرا ہوتے ہیں۔میرا بس چلے تو میں ایسے پیچ دار شعر کہنے والوں کو پرانے سوویت لیبر کیمپ میں بھجوادوں۔ہاں مدون کے لئے عروض جاننا ضروری ہے،یہ اس کی مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی،مدون اور محقق مجبور ہے کہ ہر ضروری عروضی بحث قدیم نظام کے تحت کی جائے۔یوں کہ جو اشعار زیر بحث آتے ہیں،وہ اسی قدیم نظام کے تحت کہے گئے ہیں۔کسی بھی جدید نظام کے تحت ان پر گفتگو نہیں کی جاسکتی۔کی جائے گی تو وہ قابل قبول نہ ہوگی۔جس طرح جدیدیت،ما بعد جدیدیت،رد تشکیل وغیرہ مباحث تخلیق کاروں کے کام کی چیز نہیں،یہ صرف ناقدین کی سخن طرازیوں کے لئے ہیں،اسی طرح عروض بھی شاعروں کے لئے نہیں،شاعری پر بحث کرنے والوں کے لئے کبھی کبھار ضروری ہوسکتا ہے۔

(رشید حسن خان کے خطوط(دوسری جلد):مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج،نئی دہلی۔سن ص۔529)

رشید حسن خان کے خطوں کا ایک وافر حصہ وہ بھی ہے،جہاں پر مبتدی شعراء کے اچھے کلام پر داد دیتے ہیں وہیں وہ ان کے ناہموار و بھدے کلام کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔اختر شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں:

''تمہارے شعر دیکھے،تم کو سلیقہ ہے شعر کہنے کا،مگر شاید جلدی کرتے ہو اور غالباً مطالعہ بالکل نہیں کرتے۔اگر شعر کہنا چاہتے ہو تو محنت کرو،پڑھنے پر بھی اور غور وفکر پر بھی،اس کے بغیر اچھے شعر نہیں ہوتے۔اگر گھبرانہ جاؤ گے اور توجہ کروگے تو میری تحریر پر،تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔شاعری اب اتنی آگے بڑھ گئی ہے اور اردو میں اتنے اچھے شعر کہے جا چکے ہیں،کہ معمولی اشعار کے

Scanned with CamScanner

لئے مطلق گنجائش نہیں۔اس طرح معمولی شاعر کی بھی کچھ حیثیت نہیں ۔اس بات کو دھیان میں رکھو کہ مشاعرے والی شاعری اصل میں شاعر کو تباہ کیا کرتی ہے،یہی حال محفلوں کی واہ واہ کا ہوتا ہے۔امکان بھر اس سے بچنا چاہیے۔دعائے نیم شب ---اس میں'خوشبو مہکی' بے معنی ہے۔پھول مہکتا ہے ۔یادیں بھی مہکتی ہیں کہ ان کا استعارہ پھول سے کیا جاسکتا ہے،خوشبو نہیں مہکتی ۔''پہیلی'' سامنے کا لفظ تھا ،غور نہیں کیا تم نے۔گلے مل کر ------یہ مبتذل شعر ہے۔لفظ بھی پامال ،مفہوم بھی پامال ----تصور میں تمھیں -----یہاں بھی وہی بات ہے نہ مفہوم میں خوبی نہ انداز بیان میں حسن ۔ایک بات اور پہلے مصرعے میں تصور اور محفوظ جیسے لفظ ہیں اور دوسرے مصرعے میں'ملن' جو صوتی اعتبار سے ان سے میل نہیں کھاتا ۔اس سے پورے شعر میں عدم تناسب بھی پیدا ہو گیا ہے۔لفظوں کی سطح زیادہ سے زیادہ یکساں ہونی چاہیے ۔عدم تناسب بڑا عیب ہے۔حسین چہرے غنیمت ہے مگر کوئی خاص بات نہیں،اس کے علاوہ نسیم صبح گاہی سے جس طرح خطاب کیا گیا ہے وہ مصرعے کی نشست الفاظ میں چسپاں نہیں ہوتا ۔مفہوم سامنے کا ہے اور معمولی۔مجھے چھوڑا تھا ----در زنداں پہ ----یہ دو شعر مجھے پسند آئے ،خاص طور پر پہلا شعر ۔ان میں بیان کا حسن ،الفاظ کا تناسب ،مفہوم کی معنویت سارے اجزا ہیں یہی شعر کی خوبی ہوتی ہے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط (دوسری جلد): مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص۔65)

اسی طرح سلمان احمد ربابؔ رشیدی کو لکھتے ہیں:

''تمہارے یہ اشعار،تمھارے پہلے کے انداز سے کچھ کم میل کھاتے ہیں۔تلقین اچھی بات سہی، مگر وہ سب کچھ نہیں، بہت کچھ بھی نہیں۔پوری زندگی شاعر کا مقصود نظر ہوتی ہے اور زندگی کا منظر نامہ بس ایک دو طرح کے خیالات سے عبارت نہیں ہو سکتا۔زندگی کی کثیر الجہتی کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔نعتیہ انداز بہت کچھ ہے، مگر وہ پوری شاعری کا بدل نہیں بن سکتا۔تکرار محض بن کر رہ جاتا ہے۔ہر چیز کو اپنے دائرے کے اندر رہنا چاہیے۔آدمی دن بھر نماز پڑھتا رہے تو اسے ثواب بھلے ہی مل جائے مگر قدرت کا منشا مکمل نہیں ہوتا ۔آدمی کو صرف نماز پڑھنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔کائنات کی وسعت کو نظر شاعر کا حرف رہنا چاہیے۔''

(رشید حسن خان کے خطوط : (جلد اول) مرتب ڈاکٹر ٹی ۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص625)

اسی طرح سے رشید حسن خان کو چاہے وہ ترقی پسند تحریک ہو یا جدیدیت و مابعد جدیدیت کے رجحانات ان کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی دیتی ہے۔وہ ربابؔ رشیدی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے کچھ ایسے شعر بھی کہیں ہیں لیکن عام طور پر ان کے یہاں وہ چیز کارفرما نظر آتی ہے جسے سخت گری کہتے ہیں اور صناعت سے جس کا تعلق نہیں ہوتا اور میں جسے ساختگی کہتا ہوں ،کہ کوشش کر کے لفظی نیاپن پیدا کیا جائے۔اس کوشش نے کئی شاعروں کے کلام میں اس بے ساختگی کو گویا ختم کر دیا ہے جو شعر کی حقیقی خوبی ہوتی ہے اور جس کے اثر شعر ذہن کے بجائے دل کا حصہ بن جاتا ہے'از دل خیزد و بر دل ریزد 'اسی کو کہتے ہیں ،باقیؔ ،منمو ہن تلخ،اور عرفان صدیقی یہ سب اپنے اپنے انداز سے اسی کے مارے ہوئے ہیں ۔ایک خاص طرح کا اچنا پن شعر میں تہ نشین ہو جاتا ہے جو نئے پن کی لحاتی چمک پیدا کر دیتا ہے۔فاروقی صاحب جدید یدیت کے اس نئے پن کے مبلغ ہیں جو ظفر اقبال کا طرہ امتیاز ہے اور جسے مجھ جیسے لوگ غیر شاعرانہ زبان اور بیان بازی گری کہتے ہیں ،یوں یہ دونوں تو مجبور ہیں کہ اس راگ کو خاصے اونچے سر میں الاپیں ۔باقی لوگ ناقل نا عاقل ہیں ،نقل مطابق اصل ۔ ان کے بڑے بھائی نیاز میرے عزیز دوست یوں میں ہمیشہ ان کو چھوٹا بھائی سمجھا مگر ان کو سمجھایا کبھی نہیں ،یوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ جس دائرے کے اسیر ہیں،ان سے باہر نہیں نکل پائیں گے ۔تم خود بتاؤ کہ ظفر اقبال جیسے لوگوں کو جو صاحب عمدہ شاعر مانیں،ان کی پسند کے لئے کیا کہا جائے گا ؟جس طرح فاروقی صاحب نے 60 کے بعد افسانہ نگاروں کے ایک بڑے گروہ کو بے معنی افسانہ نویسی کے پھیر میں لاکر، چوپٹ کر دیا تھا،وہی کام اب غزل کی زبان اور بیان کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔لطیفہ یہ کہ وہ خود بیشتر کلاسکی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں ۔بہ ہر طور ،عرفان صدیقی

باصلاحیت شاعر تھے، مگر بے جا مفروضات نے ان کے لہجے کو نقصان پہنچایا ذرا سی مدت گزر جانے پر ان کے اچھے اشعار کا بہتر انتخاب کیا جا سکے گا اور اس نقصان کا بھی بہتر طور پر اندازہ کیا جا سکے گا جو ان کے حقیقی انداز سخن کو اٹھانا پڑا۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (جلد دوم): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص345)

شاعری ہی کی طرح جدیدیت کے تحت لکھے گئے افسانوں سے متعلق ان کے خیال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طرح کے افسانوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔نعیم کوثر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں ایک ضمنی بات کہنا چاہتا ہوں۔اب سے پچیس، تیس برس پہلے ایک لہر اٹھی تھی ایسے افسانوں کی جن میں کہانی پن کی جگہ کچھ اشارے کچھ کنایے کچھ استعارے اور کچھ مبہم باتیں ہوتی تھیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک شخص ہے جس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے کہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن گونگا ہے۔زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہے، بس اشاروں کی زبان میں باتیں کرنا چاہتا ہے۔اب جو جتنا سمجھ لے، اور سمجھے یا نہ سمجھے۔پھر یہ ہوا کہ جو بہت پڑھے لکھے لوگ ایسے افسانوں کو اعلیٰ درجے کا ادب بتاتے تھے ان کی بلند آواز دبنے لگی، حقیقی زندگی کی بے لاگ ترجمانی کے تقاضے پھر غالب آنے لگے اور افسانے میں کہانی پن کی واپسی کا راستہ ہموار ہونے لگا۔یہ ہوا مگر ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ جن لوگوں نے تنقیدی مضامین پڑھ پڑھ کر افسانے لکھنے کا سبق پڑھنا شروع کر دیا تھا ،ان کا رابطہ حقیقی زندگی کی ترجمانی سے ٹوٹ گیا تھا۔ان کے لئے بازگشت اور بازیافت کا عمل ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔اس ٹوٹ پھوٹ سے ایک بات کھری سچائی کی صورت میں سامنے آئی کہ تنقیدی مضامین پڑھ کر ان کے دباؤ تحت کے افسانہ لکھنے کا مطلب ہوگا کہ زندگی سے تعلق ٹوٹ جائے۔اچھا افسانہ نگار اپنی آنکھوں سے زندگی کو دیکھتا ہے ان آنکھوں سے جن پر کسی تنقیدی نقطہ نظر کی رنگین عینک نہیں لگی ہوتی تبھی وہ زندگی کا بے لاگ مطالعہ کر پاتا ہے۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (پہلی جلد): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص۔975)

نعیم کوثر کے نام ہی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ایک ماہر فن کی طرح مجھ جیسا ہر قاری یہ فیصلہ نہیں کر پائے گا کہ کسی مجموعے کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے، لیکن ایک باشعور قاری کی نظر یہ ضرور دیکھ لیتی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی پن کا احوال ہے اور کہانی پن کا مطلب ہوتا ہے زندگی کے کسی خاص رنگ اور روپ کی ترجمانی ۔ان دونوں مجموعوں کے افسانوں میں ہماری حقیقی زندگی کی بہت سی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں اور یہی افسانے کا مقصود اور مدعا ہے۔ایسی تفصیلات قاری کے شعور کو روشنی کی چند کرنیں مہیا کرتی ہیں، جن کی ہلکی روشنی میں عام زندگی کا مطالعہ کسی خاص جہت سے کیا جا سکتا ہے۔اسے ایک طرح سے زندگی کی بازآفرینی کا عمل کہنا چاہیے۔"

(رشید حسن خان کے خطوط (پہلی جلد): مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔سن ص۔974)

خوبصورت چیزوں سے متاثر ہونا انسانی فطرت میں داخل ہے۔غالبیات سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ پنشن کے سلسلے میں کلکتہ جاتے وقت مرزا کا مختلف شہروں میں قیام رہا جن میں سے ایک بنارس بھی تھا۔بنارس و اہل بنارس کی تعریف میں انہوں نے فارسی میں 'چراغ دیر' کے نام سے ایک مثنوی کہی تھی۔اس سے ہم مرزا کی حسن پرستی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ۔یہاں پر بنارس کی حسیناؤں کی تعریف میں کہے گئے چند اشعار کے ترجمے ان کے فارسی متن سے احتراز کرتے ہوئے درج کئے جا رہے ہیں:

"ان حسینوں کے جلوؤں کی آتش افروزی برہمنوں تک کو خاک کر دینے والی ہے۔ان کے چمکتے روشن شہابی چہرے کیا ہیں گنگا کے کنارے چراغاں کا منظر ہیں ۔ان کے قد کیا ہیں، قیامت ہیں ان کی پلکیں گھنی اور لانبی ہیں اور دلوں پر نیزہ بازی کرتی ہیں ۔ان کے جسم کیا ہیں، دلوں کی عمر اور ہمت بڑھانے والے ہیں اور ان کی آسائش و راحت کی سراپا علامت ہیں ۔ان کی مستی موجوں کو ساکت و ساکن کر دینے والی ہے ۔اور ان کے جمال بدن سے پانی مجسم ہو جاتا ہے ۔ان حسینوں نے اشنان کے لئے پانی میں اتر کر اس میں آفت برپا کر دی ہے اور

Scanned with CamScanner

سینوں میں سیکڑوں دل مچھلیوں کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ان کے جلووں کی تاب نہ لاکر سیپوں میں پڑے موتی ،پانی ہوگئے ہیں۔"

(ص 97۔غالب۔فکر وفرہنگ: ڈاکٹر تحسین برکاتی۔غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی،سن2012)

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر میں ایک جگہ لکھا ہے:

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں ۔تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں،حسن ہے اور حسن اپنا مطالبہ رکھتا ہے۔افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبے کا جواب دینا نہ سیکھا ہو۔"

رشید احمد خان پر حسن کا اثر ہوتا ہے۔وہ اشفاق حسن خاں کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک بات کا افسوس رہے گا کہ نگاہوں میں یہاں کے جلوہ ہائے شرر انگیز کے عکس محفوظ رہیں گے،جو پریشان خیالی کو جگاتے رہیں گے۔بھلا اس 'قصہ تہذیب' وہ دور بے حجابانہ کہاں ملیں گی ،اور برہنہ بازوؤں،گنبدی چھاتیوں ،شفاف پنڈلیوں اور نمایاں شکموں کی جھلکیاں کیسے نظر آئیں گی۔وہ ملبوس جن پر دور سے آئینہ شفاف کا گمان گزرتا ہے،وہ بلاؤز جو محرم کی برابری ،بل کہ اس سے بھی کچھ مختصر ہونے کی قسم کھاتے ہیں،وہ رفتار کہ 'موج مے' جس کے سامنے پانی پانی ہو جاتی ہے،شکم صاف کی متحرک جھیلیں،اور سینوں کے وہ روشن فانوس،عریاں پنڈلیوں کی وہ روشن شمعیں ،اور چمک دار بازوؤں کی متحرک کمانیں کہاں نظر آئیں گی،وہ پیکر خوبی جن کو شاخ گل کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا اور وہ ہجوم مہوشاں ،جن کو دیکھ کر کہکشاں کا جھرمٹ نگاہوں سے گر جاتا ہے،وہ بے باک جوانیاں ،وہ بے جھجک نگاہیں ،وہ نمود بے محابا کی سحر کاریاں ،اور وہ انداز سپردگی کی چغلی کھاتا ہوا طرز بے نیازی،یہ سب کہاں ملے گا ہائے ہائے!!۔"

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج،نئی دہلی۔سن 2011ص۔ 242)

اس طرح وہ سلمان احمد رباب رشیدی کو لکھتے ہیں:

"میاں!خمیرہ اب کیا کرے گا !اب تو کوئی نسخہ بیاض مسیحا ملے تو بات بنے ۔دہلی میں تو صبح سے شام تک آنکھیں روشن ہوتی رہتی تھیں اور چہرہ شاداب۔ہزارناٹک ایک طرف،اور وہ مناظر ایک طرف۔اب اس شہر میں ہوں جہاں گلیاں کوڑے کرکٹ سے بھری رہتی ہیں۔بیمار نہیں رہوں تو کیا تندرست رہوں گا،جب سے آیا ہوں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ چلتے چلتے اچانک آنکھوں میں چراغ جل اٹھے ہوں۔جب دیکھوں تو سید صاحب کو یا ان جیسے دوسرے کو ،صحت کیسے حاصل ہو پائے گی۔"

(رشید حسن خان کے خطوط(جلد اول):مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا۔اردو بک ریویو،دریا گنج،نئی دہلی۔سن 2011ص۔616)

کسی بھی قوم کی ترقی وتنزلی کا راز اس کے طریقہ تحقیق وتنقید میں ہی مخفی ہوتا ہے۔اگر کوئی قوم اپنی مصاف زندگی میں ان ہتھیاروں سے کام لیتی ہے تو وہ اپنی زندگی کے ہفت خواں کو بآسانی ہی طے نہیں کرتی ہے۔بلکہ وہ آسماں میں اُگے تاروں کی بھی ہمدم و ہم ساز بن جاتی ہے۔اگر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچنے میں ہم ،آپ کو ذرا بھی تامل نہیں ہوگا کہ دراصل درخت کے پتوں سے لے کر حریر و پرنیاں اور غاروں اور کھوہوں سے لے کر برج خلیفہ تک میں انسان کی اسی ذہنیت اور عمل کی کار پردازی نظر آتی ہے۔

آج جو تنقید وتحقیق کی مٹی پلید ہو رہی ہے وہ کسی ایک ملک، ایک قوم یا کسی ایک زبان تک ہی محدود نہیں ہے۔ہندوستان کے ایک اہم ادارے یو جی سی نے بہت پہلے اپنی ایک رپورٹ میں اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ اس وقت چاہے سائنس ہو یا آرٹ کسی بھی شعبے میں نئی ریسرچ سامنے نہیں آرہی ہے۔ایسے میں ایک بے بضاعت زبان اردو کی طرف اس امید سے دیکھنا کارعبث ہی ہے۔اس گھپ اندھیرے میں جب ہم رشید حسن خان کی تنقیدی وتحقیقی کاوشوں طرف دیکھتے ہیں تو ہم کو ایک طرح کی طمانیت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے۔بلکہ ہمارا سر فخر سے اونچا بھی ہو جاتا ہے۔سطور بالا میں ہم نے رشید حسن خان کے کارنامے کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لینے کوشش کی ہے۔یہ ہمارے لئے امید افزا ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ریسرچرز اور اسکالرز رشید حسن خان کی تقلید واتباع کر کے ان کے کاز کو آگے بڑھائیں۔

□□□

Scanned with CamScanner

دستنبوؔ کے اردو ترجمے کا قضیہ اور رشید حسن خاں

ابراہیم افسر

وارڈ نمبر ۱، مہپا چوراہا
نگر پنچایت سیوال خاص
میرٹھ
رابطہ: 9897012528

اشعر نجمی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ اثبات کا شمارہ 18+ 19 ''چوں کفر از کعبہ بر خیزد، مشاہیر علم وادب کے سرقوں کا محاسبہ''' پر مشتمل ہے۔ اثبات کے اس شمارے میں اُردو ادب کے سرقوں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ رسالہ اثبات کے اس خاص شمارے میں ڈاکٹر خالد علوی (سابق اُستاذ، شعبہ اُردو، ذاکر حسین کالج، دہلی) کا مضمون [ایوان اُردو، دہلی، جون 2014] کے شکریے کے ساتھ ''قصہ کچھ کتابوں کا'' کے عنوان سے صفحہ 75 تا 85 شامل ہے۔ خالد علوی نے اس مضمون میں اُن کتابوں کا جائزہ پیش کیا ہے جنھیں تھوڑی رد و بدل کے ساتھ یا من وعن دوسرے لوگوں نے اپنے نام کے ساتھ شائع کرایا۔ اس مضمون میں خالد علوی نے دستنبو (اُردو ترجمہ) خواجہ احمد فاروقی، کے عنوان سے جو شواہد پیش کیے ان میں دعوا کیا ہے کہ:

''شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی نے دستنبو کا ترجمہ خواجہ احمد فاروقی کے نام سے شائع کیا تھا۔ بعد میں یہی ترجمہ کونسل برائے فروغ اُردو نے خواجہ احمد فاروقی کے نام سے شائع کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے ڈاکٹر معین الرحمن کی کتاب 'غالب اور انقلاب ستاون' شائع کی تو یہ ترجمہ بھی کتاب میں شامل کیا اور مترجم کی حیثیت سے رشید حسن خاں کا نام شامل کیا۔ اگر کتاب میں رشید حسن خاں کا طویل پیش لفظ شامل نہ ہوتا تو طباعت و کتابت کی غلطی کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ 'پیش لفظ' میں 'دستنبوؔ کے فارسی متن پر خاصی خامہ فرسائی کی گئی ہے لیکن ترجمہ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔ راقم الحروف نے اس ترجمے کا خواجہ صاحب کے ترجمے سے حرف بہ حرف موازنہ کیا لیکن کوئی فرق نہ پایا۔ چوں کہ یہ کتاب رشید حسن خاں کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی، اس لیے ہم یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ ترجمہ رشید حسن خاں کی ایما پر ہی شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں اکثر یہ تاثر دیا کرتے تھے کہ خواجہ احمد فاروقی کی زیادہ تر تخلیقات ان کی (رشید حسن خاں) مرہون منت ہیں۔ بفرض محال ایسا تھا بھی تو اشاعت کے بعد کسی شائع شدہ تخلیق (ترجمہ) کو دوسرے نام سے شائع کرنا کسی حد تک درست ہے؟

افسوس یہ ہے کہ کسی نے آج تک اس طرف توجہ نہ کی جب کہ خود رشید حسن خاں دوسروں کی گرفت کرنے میں بہت آگے رہتے تھے۔اگر اپنے نام سے 'ترجمہ دستنبو' شائع کرنا ضروری تھا تو بیانگ دہل وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ یہ ترجمہ خواجہ احمد فاروقی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔''

(رسالہ اثبات، کتابی سلسلہ 18+19، تھانے، مہاراشٹر، صفحہ 82)

مذکورہ بالا سطور میں خالد علوی نے واضح کر دیا ہے کہ 'دستنبو' کو رشید حسن خاں نے اپنے نام سے شائع کیا جب کہ یہ ترجمہ خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔رشید حسن خاں اور خواجہ احمد فاروقی دونوں ہی ہمارے ادبی بزرگ تھے، جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''دستنبو' کے اُردو ترجمے کے تعلق سے میں نے جو تحقیق کی وہ چونکانے والی رہی۔دہلی یونی ورسٹی، دہلی کے شعبہ اُردو نے غالب صدی تقریبات کے سلسلے اور اسے یادگار منانے کے لیے ایک ادبی مجلہ ''اُردوئے معلیٰ' جاری کیا۔رشید حسن خاں اس مجلے میں، پرنسپل ہریش چندر، نکہت جہاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، صدیق الرحمن قدوائی ،ڈاکٹر قمر رئیس، مصباح الدین شکیل اور عتیق احمد صدیقی کے ساتھ مجلس ادارت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔خواجہ احمد فاروقی نے 'اُردوئے معلیٰ، دہلی' کے شمارہ 2، 3، جلد دوم غالب نمبر حصہ دوم 1961 میں شائع کیا۔اسی رسالے میں پہلی بار مرزا غالب کے فارسی روزنامچے دستنبو کا ترجمہ اُردو میں صفحہ 177 تا 232 شائع کیا گیا۔لیکن اس ترجمے کو رشید حسن خاں یا خواجہ احمد فاروقی کس نے کیا؟ یہ واضح نہیں تھا۔لیکن مخمور سعیدی نے رشید حسن خاں کی وفات کے بعد لکھے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں' میں اس بات کا صاف اشارہ کیا ہے کہ 'دستنبو' کا ترجمہ خواجہ احمد فاروقی نے نہیں رشید حسن خاں نے کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ایک اور معاملے میں میں نے اکثر لوگوں کو ،بالخصوص ان لوگوں کو جن کی کارکردگی کسی خاص شعبے میں تسلیم کی جا چکی ہو، بخیل پایا ہے، وہ ہے دوسروں کے اچھے کاموں کا اعتراف ۔خاں صاحب اس معاملے میں فراخ دل تھے۔غالب صدی تقریبات کے موقع پر دہلی کے دو رسائل ''اُردوئے معلیٰ' اور 'تحریک' نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں غالب کی فارسی کتاب 'دستنبو' کے اُردو تراجم شائع کیے ۔'اُردوئے معلیٰ' میں جو ترجمہ شائع ہوا وہ خاں صاحب کے نام سے نہیں تھا لیکن کیا ہوا انھیں کا تھا۔'تحریک' میں جو ترجمہ شائع ہوا وہ میں نے کیا تھا۔دونوں رسالے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئے ۔خاں صاحب نے میرا ترجمہ پڑھا تو اس کی داد ان لفظوں میں دی کہ''آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں غالب کے اسلوب کو بھی اُردو میں منتقل کر لیا ہے۔''

(رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں،،جلد اول ،مرتب راقم الحروف، کتابی دنیا، دہلی 2019، صفحہ 251)

ڈاکٹر سید معین الرحمن نے اپنی کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' کے صفحہ 95 پر اس بات کی صراحت کی کہ 1961 میں دو ترجمے ہوئے جن میں ایک ترجمہ مخمور سعیدی کا اور دوسرا رشید حسن خاں کا تھا۔لکھتے ہیں:

''1961 میں دستنبو کے دو الگ الگ کلی تراجم سامنے آئے ۔ایک ترجمہ رسالہ تحریک دہلی، اپریل مئی 1961 (ص 53-73) میں چھپا تھا۔یہ ترجمہ مخمور سعیدی کا ہے۔دوسرا ترجمہ رسالہ اُردوئے معلیٰ دہلی جلد دوم شمارہ 2، 3 بابت فروری 1961 (ص 177-232) شائع ہوا یہ ترجمہ رشید حسن خاں صاحب کا کیا ہوا ہے۔یہی ترجمہ رسالہ افکار (کراچی) کے غالب نمبر میں بھی اُردوئے معلیٰ سے نقل کیا گیا تھا۔یہی ترجمہ ضروری حواشی کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔حواشی میرے لکھے ہوئے ہیں۔''

(غالب انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمن ،غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی، 2007، صفحہ 95)

رشید حسن خاں کے 'دستنبو' کے اُردو ترجمے کی روداد، اس کی اہمیت اور غرض وغائیت کو سلسلے وار طریقے سے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'دستنبو' کے مقدمے میں یوں بیان کیا:

''ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور نے ''غالب اور انقلاب ستاون'' پاکستان سے پہلی بار 1974 میں شائع کی۔یہ بعض ضروری ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ 1976 میں لاہور سے دوبارہ شائع ہوئی۔ان دونوں اشاعتوں میں دستنبو کا رشید حسن خاں صاحب کا اُردو ترجمہ شامل ہے۔1988 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے 'غالب اور انقلاب ستاون'' کی دوسری اشاعت کو

Scanned with CamScanner

اس اضافے کے ساتھ شائع کیا کہ اس میں دستنبو کے اس مطبوعہ متن کا عکس بھی شامل کر دیا جو سب سے پہلے غالب کی اپنی کڑی نگرانی میں آگرہ سے 1858 میں شائع ہوا تھا۔''

(دستنبو، پروفیسر شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007، صفحہ د،ذ)

پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقدمے میں مخمور سعیدی کے اس دعوے کی تائید کی جس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ دستنبو کے دو ترجمے ہوئے ایک خود مخمور سعیدی کا اور دوسرا رشید حسن خاں کا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی لکھتے ہیں:

''دستنبو کا اُردو میں کئی بار ترجمہ ہوا ہے۔ ان میں سے دو تراجم راقم کے پیش نظر رہے۔ رشید حسن خاں صاحب کا ترجمہ زیادہ مکمل اور اصل سے قریب تر ہے۔ اس میں دستنبو کے مطالب کی بہتر افہام و تفہیم کے لیے اُردو الفاظ و عبارات میں رد و بدل کی گنجائش تھی۔''

(دستنبو، پروفیسر شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2007)

رشید حسن خاں نے 'دستنبو' کے ترجمے اور اس کی اشاعت کے بارے میں پروفیسر حنیف نقوی کو 21 اپریل 1986 کو ایک طویل خط لکھا ۔ اس خط میں انھوں نے واضح کیا کہ 'دستنبو' کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اب آپ سے ایک بات مشورہ طلب ہے۔ 'دستنبو' کا چھاپا جانا ضرورری ہے مع اُردو ترجمہ اور مقدمہ۔ ترجمے اُس متن کے دو ہو چکے ہیں، کسی ایک پر نظرِ ثانی کرکے اُسے شامل کیا جاسکتا ہے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، اُردو بک ریویو، دہلی، نومبر 2015، صفحہ 141)

'دستنبو' کے اُردو ترجمے اور رشید حسن خاں سے متعلق جو باتیں خالد علوی صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر کی ہیں ان میں کہیں بھی مستند دلیل اور حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ رشید حسن خاں خود اُردو اور فارسی کے بڑے اسکالر تھے۔ ان کی فارسی اتنی اچھی تھی کہ انھیں کسی کے ترجمے کو اپنے نام سے شائع کرانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی میں اس لیے بلائے گئے تھے تاکہ وہ قدیم کلاسیکل مخطوطوں کا ترجمہ اُردو میں کریں۔ خواجہ احمد فاروقی کو خود اس بات کا علم تھا کہ رشید حسن خاں جیسا ذہین وفطین اور بالغ نظر اسکالر ان کے کام کی چیز ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی وساطت سے اگست 1959 میں رشید حسن خاں کو کاغذی اسناد نہ ہونے کے باوجود شعبہ اُردو میں نوکری دی گئی۔ 1959 سے قبل رشید حسن خاں کے بیش تر مضامین ہندوستان اور پاکستان کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ الغرض رشید حسن خاں نے اُردو املا، شاعری کی زبان، ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بیانہ کا مسئلہ اور اپنے ہم عصر شاعروں کے کلام میں زبان اور بیان کے مسائل کو انھوں نے اپنے مضامین کا حصہ بنایا۔ کلاسیکل ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ رشید حسن خاں کی علم دوستی اور محنت شاقہ کی بدولت ہی خواجہ احمد فاروقی نے انھیں رسالہ اُردوئے معلّٰی کی مجلس ادارت میں شامل کیا۔ خواجہ احمد فاروقی نے رشید حسن خاں کو غالب کی صدی تقریبات کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب 'اشاریہ کلامِ غالب'' کے مرتبین میں شامل کیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''پہلی بار غالب کا ترجمہ کے مسائل پر ایک بین الاقوامی گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں رالف رسل اور ڈاکٹر شمل نے بھی شرکت کی۔ شعبے نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب غالب، رشید حسن خاں صاحب ، ڈاکٹر فرحت فاطمہ اور محمد یعقوب کا مرتب کیا ہوا 'اشاریہ کلامِ غالب'' شائع کیا۔ غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی نے مطبوعات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، ان میں ''اشاریہ کلامِ غالب'' کی بڑی اہمیت ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''اشاریہ 'کلامِ غالب'' کی حیثیت کتاب الاستاد کی ہے، جس کو رفقائے کار جناب رشید حسن خاں، آنسہ فرحت فاطمہ اور جناب محمد یعقوب نے مل کر ترتیب دیا ہے۔''

(بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، خلیق انجم، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2000، صفحہ 71)

رشید حسن خاں نے اسلم محمود کے نام 13 مارچ 2001 کو لکھے خط میں اس بات کی وضاحت کی کہ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی بیٹی کو اشاریہ کلامِ غالب میں شامل کرنے کے لیے یہ کتاب مرتب کرائی۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب کی اہمیت کو نظر کرتے ہوئے اسے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا اور نہ ہی اس کا شمار اپنی

Scanned with CamScanner

تدوینات میں کیا۔اشاریہ کلامِ غالب کے بارے میں مزید باتیں درج ذیل خط میں ملاحظہ کیجیے:

"اشاریہ کلامِ غالب کے نام کی میری کوئی کتاب نہیں۔خواجہ فاروقی صاحب نے اپنی بیٹی کو کسی کام میں شامل کرنے کے لیے اس کتاب کو مرتب کرلیا تھا۔یعقوب صاحب تھے ایک ریسرچ اسسٹنٹ،وہ تھے اور اُن کی صاحب زادی۔انھی دونوں نے یہ کام کیا تھا۔

خواجہ صاحب نے یہ کیا کہ چھپتے وقت میرے علم کے بغیر نیچے میرا نام بھی لکھ دیا۔کیا کرسکتا تھا۔بہرطور یہ کتاب شعبے کی طرف سے چھپی تھی۔میرے پاس یہ نہیں،میں اسے اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ اپنے پاس رکھتا۔"

(رشید حسن خاں کے خطوط،مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا،اُردو بک ریویو، دہلی،فروری 2011،صفحہ 217)

رشید حسن خاں نے 2اگست 2001 کو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے نام لکھے خط میں بھی 'اشاریہ کلامِ غالب کے بارے میں جو باتیں تحریر کی وہ کافی اہم ہیں۔اس خط میں رشید حسن خاں نے اس بات کو واضح کیا کہ اشاریہ کلامِ غالب میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔خواجہ احمد فاروقی نے اپنی جانب سے ان کا نام اس کتاب کے مرتبین میں شامل کیا ہے۔رشید حسن خاں اس کتاب کے اندراجات سے ذرا بھی مطمئن نہ تھے۔لکھتے ہیں:

"جس کتاب کا نام آپ نے پوچھا ہے،اُس کا نام ہے:اشاریہ کلامِ غالب۔یہ عرض کردوں کہ یہ مرحوم فاروقی صاحب کا کرایا ہوا تھا اور اُن کے کرائے ہوئے سارے کام ساقط العیار ہیں،یہ بھی ویسا ہی ہے۔انھوں نے صدر کی طاقت سے کام لے کر آخر میں میرا نام بھی دو دوسرے ناموں کے ساتھ لکھ دیا تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا،مگر میرا حصہ دور کا جلوہ ہے اور بس۔اس کے اندراجات سے میں ذرا بھی

"جس کتاب کا نام آپ نے پوچھا ہے،اُس کا نام ہے:اشاریہ کلامِ غالب۔یہ عرض کر دوں کہ یہ مرحوم فاروقی صاحب کا کرایا ہوا تھا اور اُن کے کرائے ہوئے سارے کام ساقط العیار ہیں،یہ بھی ویسا ہی ہے۔

انھوں نے صدر کی طاقت سے کام لے کر آخر میں میرا نام بھی دو دوسرے ناموں کے ساتھ لکھ دیا تھا اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا،مگر میرا حصہ دور کا جلوہ ہے اور بس۔اس کے اندراجات سے میں ذرا بھی مطمئن نہیں اور نہ ماٰخذ سے۔ہاں یہ خواہش ضرور تھی کہ اس کام کو میں اپنے انداز سے کر سکتا۔کبھی کروں گا ضرور،مگر وہ کبھی کب آئے گا یہ معلوم نہیں۔"

مطمئن نہیں اور نہ ماٰخذ سے۔ہاں یہ خواہش ضرور تھی کہ اس کام کو میں اپنے انداز سے کر سکتا۔کبھی کروں گا ضرور،مگر وہ کبھی کب آئے گا یہ معلوم نہیں۔"

(رشید حسن خاں کے خطوط،مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا،اُردو بک ریویو، دہلی، فروری 2011،صفحہ 716)

رشید حسن خاں کی اشاریہ کلامِ غالب کو ترتیب و تدوین کرنے کی خواہش آخر کار پوری ہوئی اور انہوں نے امتیاز علی خاں عرشی کے مرتب شدہ دیوانِ غالب کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی وفات سے 10ماہ قبل 16اپریل 2005 کو "گنجینۂ معنی کا طلسم،اشاریہ دیوانِ غالب" عنوان سے مرتب کرا انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی اور انجمن ترقی اُردو ہند کے باہمی اشتراک سے یہ کتاب تین جلدوں میں (جلد اول 2017،جلد دوم 2018 اور جلد سوم 2019) شائع ہوگئی ہے۔

رشید حسن خاں نے 16 ستمبر 1997 کو ڈاکٹر ارجمند آرا کے نام خط لکھتے وقت صدر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور ان کے مابین ہوئے نظریاتی اختلاف کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا کہ خواجہ احمد فاروقی سے ان کا جھگڑا ہوا جس کی وجہ سے انھیں گریڈ نہیں دیا گیا۔گریڈ نہ ملنے کی وجہ سے رشید حسن خاں کو مالی خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن ان کی انا اور خود داری نے انھیں کسی کے سامنے جھکنے نہ دیا ۔بھلے ہی انھیں کتنی ہی تکالیف برداشت کرنا پڑی ہوں:

"میں نے تمہارے خط کو دو بار توجہ سے پڑھا۔تم سے مجھے شروع سے ہی ہمدردی رہی ہے اور اب بھی ہے۔تم نے وہ مثل سنی ہے :خصم کیا،بُرا کیا،کر کے چھوڑا،اور بُرا کیا۔میں کبھی اپنے کیے پر پشیمان نہیں ہوا،خواہ کتنا ہی پریشان رہا ہوں۔خواجہ احمد فاروقی سے جھگڑا کرلیا،جو 27سال تک برقرار رہا۔بہت نقصان اٹھایا،مگر پچھتایا نہیں۔آج تم کو بتارہا ہوں

Scanned with CamScanner

کہ یہ جھگڑا ذکیہ انجم کے سلسلے میں ہوا تھا۔ کبھی نہیں گھبرایا، کبھی نہیں شرمایا اور کبھی پشیمان نہیں ہوا۔ بہت نقصان اُٹھایا، گریڈ نہیں ملا۔ نہ ملے، نقصان ہوتا ہے تو ہو، کرے پچھتانا شیوۂ دوست داری کے خلاف ہے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، اردو بک ریویو، دہلی، فروری 2011، صفحہ 152)

رشید حسن خاں نے شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں آنے کے بعد کلاسیکل کتابوں کے متن کو اہتمام کے ساتھ ترتیب دینے کا کام کیا۔ فسانۂ عجائب، ان کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھا جسے خواجہ احمد فاروقی کے مقدمے کے ساتھ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ لیکن رشید حسن خاں اس اڈیشن کے علاوہ ایک معیاری اور تدوین کی کسوٹی پر کھرا اُترنے والا اڈیشن مرتب کرنا چاہتے تھے۔ شعبۂ اُردو میں اس بات کا چرچہ ہوا۔ لیکن کچھ طاقت ور لوگ رشید حسن خاں کی محنت کو اپنے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ رشید حسن خاں کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے فسانۂ عجائب کا کام روک دیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے نام 5 مارچ 1984 کو ایک طویل خط صرف اور صرف فسانۂ عجائب کی تدوین اور اس کی اشاعت میں درآئی رکاوٹوں کے بارے میں رقم کیا۔ اس خط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کے خلاف شعبۂ اُردو میں ادبی سازشیں کی گئیں۔ ان کی تدوینات کو کچھ لوگ اپنے نام سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ اس خط میں رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی (صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی) کا لکھا پیش لفظ بھی رقم کیا ہے۔

مذکورہ باتوں کے مدنظر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خالد علوی صاحب نے اپنے مضمون میں ان باتوں کو ملحوظ نہیں رکھا جو میں نے اس مضمون میں تحریر کی ہیں۔ موصوف نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ خواجہ احمد فاروقی جو ایک طویل مدت تک صدر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی رہے اور جنھوں نے شعبۂ اُردو کے علاوہ رشید حسن خاں سے اپنے گھر پر بھی ذاتی کام کرائے۔ یہاں تک کہ خواجہ احمد فاروقی کے گھر پر کام کرتے وقت رشید حسن خاں سے کسی کو ملنے نہیں دیا جاتا تھا اگر کوئی غلطی سے رشید حسن خاں سے ملنے چلا بھی گیا تو انھیں سخت ڈانٹ ڈپٹ پڑتی تھی۔

رشید حسن خاں نے شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں آنے کے بعد کلاسیکل کتابوں کے متن کو اہتمام کے ساتھ ترتیب دینے کا کام کیا۔ فسانۂ عجائب، ان کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھا جسے خواجہ احمد فاروقی کے مقدمے کے ساتھ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ لیکن رشید حسن خاں اس اڈیشن کے علاوہ ایک معیاری اور تدوین کی کسوٹی پر کھرا اُترنے والا اڈیشن مرتب کرنا چاہتے تھے۔ شعبۂ اُردو میں اس بات کا چرچہ ہوا۔ لیکن کچھ طاقت ور لوگ رشید حسن خاں کی محنت کو اپنے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ رشید حسن خاں کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے فسانۂ عجائب کا کام روک دیا۔

خواجہ احمد فاروقی کا ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو نے پہلی بار 1994 میں شائع کیا۔ دوسری بار 2011 میں اسے شائع کیا۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ 'دستنبو' کے جو تراجم موجود ہیں ان میں رشید حسن خاں کا ترجمہ سب سے پہلے شائع ہوا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کو بھی اس بات کا علم تھا کہ رشید حسن خاں کا ترجمہ افکار کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ رشید حسن کے احباب بالخصوص پروفیسر قمر رئیس اور مخمور سعیدی وغیرہ بھی جانتے تھے کہ جو ترجمہ اُردوئے معلّٰی، فروری 1961 میں شائع ہوا ہے وہ رشید حسن خاں کا ہی ہے۔ رشید حسن خاں نے اشاریہ کلام غالب کے حوالے سے جو باتیں تحریر کی ہیں اُن سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صاحب اقتدار اپنے ماتحتوں کا استحصال کیسے کرتے ہیں۔

تحقیق مستند، صحت مند اور معتبر حوالوں کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی اور تحقیق میں حرفِ آخر کچھ نہیں ہوتا۔ تحقیق سچ کی بازیافت کا دوسرا نام ہے۔ رشید حسن خاں اتنے کم ظرف نہیں تھے کہ وہ دوسروں کی محنت کو اپنی بتا کر تحقیق کا محل تعمیر کرتے۔ اُردو دنیا نے ان کی محنت، لگن اور آنکھوں سے تیل ٹپکانے کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تا حیات انھوں نے یہی درس دیا ہے کہ سچ لکھو۔ انھوں نے اپنے تحقیقات سے بڑے بڑے ادبی بتوں کو سجدہ ریز کیا ہے۔ ان کے ادبی کارنامے اور فتوحات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ پوری اُردو دنیا جان چکی تھی کہ 'دستنبو' کا اُردو ترجمہ رشید حسن خاں نے ہی کیا ہے۔ رشید حسن خاں کبھی بھی کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کا ماننا تھا کہ شخصیت نے جو کچھ لکھا ہے اس پر بات کی جائے۔

□□□

Scanned with CamScanner

اردو املا اور زبان و قواعد کی اصلاح میں رشید حسن خاں کا کردار

ڈاکٹر خالد ظہیر

محلہ اسلام آباد
شیام پور روڈ، کٹھور
میرٹھ
رابطہ: 9412473222

اُردو ادب کی تاریخ میں رشید حسن خاں اس روشن ستارے کی مانند ہیں جس کی روشنی اور تابناکی سے آئندہ نسل استفادہ کرتی رہے گی۔ یہ نابغۂ روزگار شخصیت 25 دسمبر 1925ء (عام طور پر رشید حسن خاں کی یوم پیدائش 10 جنوری 1930ء بتائی جاتی ہے، لیکن یہ درست نہیں) کو اُتر پردیش کے مردم خیز علاقے شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئی۔ آپ نہ صرف محقق، ناقد، مدون اور تبصرہ نگار تھے بلکہ ایک اچھے مصنف کے ساتھ ساتھ تجزیہ نگار اور اُردو املا کی اصلاح کے روح رواں بھی تھے۔ یوں تو ان میں بہت سی خوبیاں موجود تھیں لیکن اُردو ادب میں بنیادی طور پر ان کی شناخت ایک محقق اور مدون کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ان کو ''خدائے تدوین'' کا خطاب عطا کیا ہے۔ رشید حسن خاں بہت ہی محتاط محقق ہیں۔ ان کے نزدیک تحقیق کا مقصد ''حقائق کی بازیافت'' ہے۔ ان کو شخصیت میں دلچسپی نہیں بلکہ شخصیت نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں دلچسپی ہے۔ وہ حق کے متلاشی ہیں۔ وہ نہ کسی شخصیت سے مرعوب ہوئے اور نہ صلح و سمجھوتے کے قائل رہے۔ ان کے نزدیک شخصیت سے مرعوب ہونے کا مطلب ''حقائق سے چشم پوشی'' ہے۔ خاں صاحب تا عمر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز، تلاشِ حق میں سرگرداں رہے۔

رشید حسن خاں نے اُردو املا، زبان و قواعد میں نئی نئی اصلاحات پیش کیں اور املا سے متعلق بہت سے مسائل کو حل کیا۔ خاں صاحب 1959ء کے وسط میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں، صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر قمر رئیس کی کاوشوں سے، بہ حیثیت ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں خاں صاحب نے زندگی کا 30 سالہ طویل وقفہ گزارا اور 31 دسمبر 1989ء کو سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے اُردو املا، زبان و قواعد، انشائے غالب، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مثنوی گلزارِ نسیم، مثنوی سحر البیان، مثنویاتِ شوق، مصطلحات ٹھگی، کلامِ جعفر زٹلی وغیرہ کتابوں کو جدید علمی، ادبی، تحقیقی اور تدوینی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مدون کیا۔

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں نے اُردو دنیا میں جب اپنا سفر شروع کیا تو ان کا موضوع املا اور زبان و قواعد کے ساتھ فکشن تنقید اور شاعری کے معائب و محاسن (زبان و بیان کے حوالے سے) کو قارئین کے سامنے پیش کرنا تھا۔ انشا اور تلفظ پر ان کی غائر نگاہ تھی۔ یہ خاں صاحب کا وقیع کارنامہ ہے۔ اچھی عبارت لکھنے کے لیے انھوں نے تین باتوں پر زور دیا۔ لفظ کا صحیح املا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور جملے میں اس لفظ کو کس طرح لانا چاہیے۔ وہ جملے کے لیے روز مرہ، املا، تلفظ، قواعد اور محاورے کو اہمیت دیتے ہیں۔ جملے میں قواعد اور املا کی غلطی نہ ہو اور ساتھ ہی روز مرہ محاورہ بھی صحیح ہو، وہ مثالوں کے ذریعے ان کی وضاحت کرتے ہیں۔ روز مرہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس طرح لکھنا یا بولنا جس طرح معیاری اُردو بولتے اور لکھتے آئے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب کہیں "آب پی لو" تو کہا جائے گا کہ اُردو والے اس طرح نہیں بولتے۔ "پانی پی لو" کہتے ہیں۔ آب کے معنی ہیں؛ پانی۔ لفظ اپنی جگہ ٹھیک ہے؛ بامعنی ہے، دوسرے مقامات پر استعمال میں بھی آتا ہے لیکن "پینے" کے ساتھ "پانی" کا لفظ آتا ہے۔"[1]

یعنی خاں صاحب کا اشارہ اس طرف ہے کہ وہ الفاظ جو ہم روزانہ عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں، وہی روز مرہ کی تعریف میں شامل ہیں۔ اچھی عبارت کے بارے میں رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ روز مرہ محاورے اور قواعد کی غلطی نہ ہو۔ اسی کے ساتھ املا درست ہو اور اس میں بیان کا حسن بھی ہو۔ اسی کو ایک اچھی عبارت کہا جاتا ہے۔ وہ عبارت کو کئی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جملہ زبان سے ادا ہوگا تو اس میں کتنی روانی ہوگی۔ اس میں کوئی ایسا لفظ تو نہیں در آیا ہے، جس کو ادا کرنے میں زبان رُکنے لگے۔ وہ نثر میں روانی کے قائل ہیں اور اس کو اچھی نثر کی خوبی بتاتے ہیں۔

جملے دو طرح کے ہوتے ہیں، مفرد اور مرکب۔ مفرد جملہ یعنی سادہ جملہ۔ مرکب جملہ اس کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ مفرد جملوں سے مل کر بنا ہو۔ جیسے "وہ کل یہاں سے گئے تھے، لیکن آج پھر واپس آ گئے اور آتے ہی جم کر بیٹھ گئے، مگر ان کے آتے ہی کچھ دوسرے لوگ بھی آ گئے اور وہ لوگ بھی اُن سے باتیں کرنے لگے، یوں سارا دن گزر گیا۔" یہ جملہ پانچ چھوٹے چھوٹے جملوں سے مل کر بنا ہے۔ طویل مفرد جملے یا لمبے مرکب جملے بھی ضرورت کے مطابق لکھنے پڑتے ہیں۔ خاں صاحب زیادہ طویل جملوں کے قائل نہیں۔ اگر بات چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا ہو جائے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ لمبے جملوں میں کبھی کبھی زائد الفاظ در آتے ہیں اور مفہوم کے تکرار ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ عبارت میں زائد الفاظ کا در آنا اور مفہوم کی تکرار ہونا عیب ہے۔ زائد الفاظ سے مراد ایسے الفاظ سے ہے کہ ان کو اگر عبارت سے نکال دیا جائے تو معنی و مفہوم اثر انداز نہ ہوں اور عبارت پہلے سے اچھی ہو جائے۔ جملے میں جن لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے، ان سے مطلب اور مفہوم اچھی طرح واضح ہو رہا ہے یا نہیں، اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اگر ایک یا دو الفاظ کے بدلنے سے جملے کا مفہوم اچھا ہو سکتا ہے تو بہتر ہے کہ الفاظ بدل دیے جائیں۔ یعنی لفظوں کا انتخاب مناسب طور پر کرنا نہایت ضروری ہے، ساتھ ہی جملے میں ان کا استعمال بھی مناسب ترتیب میں ہو، تاکہ بیان کا حسن بڑھ جائے اور مفہوم بھی بہتر طور پر ادا ہو جائے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ ہو: "تم یہاں سے کل کیا گئے کہ گھر کی رونق ہی چلی گئی۔" اس جملے کا مطلب تو واضح ہے لیکن بیان کا حسن غائب ہے۔ جملے کا پہلا حصہ ادا کرنے میں یہ دشواری ہے کہ اس کی روانی میں خلل پیدا ہو رہا ہے۔ "کل کیا گئے کہ" کو زبان سے ادا کرنے میں روانی کی سانس ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں اس جملے کو بہتر بنانے کے لیے ایک دو الفاظ کو کم بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسے: "گھر کی رونق تمھارے ساتھ ہی چلی گئی" اس طرح مطلب اور مفہوم بھی ادا ہو گیا اور اس میں بیان کا حسن بھی در آیا۔

اس جملے پر غور کیجیے "چوں کہ وہ بیمار تھے، اس لیے میں ان کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔" اس جملے کو اس طرح بھی لکھا جا سکتا ہے: "وہ بیمار تھے۔ اس لیے میں ان کو دیکھنے گیا تھا۔" جملے سے "چوں کہ" اور "کے لیے" حذف کرنے سے روانی آ گئی۔ مفہوم میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بیان کا حسن بھی در آیا اور جملہ پہلے سے بہتر ہو گیا۔

ان جملوں پر بھی ذرا غور فرمائیں: "وہ اُدھر کو گئے ہیں"، "اب تم کدھر جاؤ گے"، "میرا گھر کو جانے کا وقت ہو گیا ہے۔" مندرجہ بالا جملوں میں "کو" زائد ہے۔ ان کو یوں لکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا: "وہ اُدھر گئے ہیں"، "اب تم کدھر جاؤ گے"، "میرا گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے"۔ ان جملوں میں روانی کے ساتھ ساتھ بیان کا حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

خاں صاحب عبارت میں بھاری بھرکم ،دقیق اور مشکل الفاظ کے بھی قائل نہیں۔ان کے نزدیک عبارت میں ممکنہ حد تک مشکل الفاظ نہ آئیں۔مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جب آسان الفاظ موجود ہیں،تو مشکل اور ادق الفاظ کیوں استعمال کیے جائیں۔رشید حسن خاں اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہاں! ہم ایک پہلو پر ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ممکن حد تک مشکل لفظ ہماری عبارت میں نہ آنے پائیں۔مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آسان لفظ موجود ہیں،تو مشکل الفاظ کو عبارت میں نہیں ٹھونسنا چاہیے۔اس ٹھونسم ٹھاس سے عبارت بے ربط ہوجاتی ہے۔بندش کی چستی باقی نہیں رہتی اور روانی ختم ہوجاتی ہے۔چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اسی کو کہتے ہیں۔پڑھتے وقت لغت کی کتاب سامنے رکھنا ضروری ہو،تو وہ نثر کیا ہوئی!یہ تو بے کمالی بلکہ بے ہنری کی پہچان ہے۔''[۲]

لفظوں کے انتخاب پر بھی آپ کی عمیق نظر تھی۔مثال دے کر بتاتے ہیں کہ جیسے ''حتی الامکان'' کی جگہ'' امکان بھر''اور ''علی الصباح'' کے بدلے''صبح تڑکے'' لکھ سکتے ہیں۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ؛یہ امر میرے لیے باعث شہرت ہوگا۔''اس کی جگہ آسان جملہ لکھا جا سکتا ہے۔جیسا کہ''اس سے مجھے مسرت حاصل ہوگی''۔یعنی''امر''اور''باعث''جیسے ادق الفاظ کیوں لکھے جائیں،جب ان کے ہم معنی آسان الفاظ موجود ہیں۔ان کے نزدیک لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو مدنظر ہونا چاہیے کہ معنی و مطلب اور مفہوم صحیح طور پر ادا ہوجائے۔عبارت میں ممکنہ حد تک سادگی رہے۔عبارت میں لفظوں کی تکرار بھی مناسب نہیں۔یہ بھی ایک عیب ہے۔جس سے عبارت کا حسن مضمحل ہوتا ہے۔جیسے''میں نے کہا ضرور تھا کہ میں تمھارے ساتھ چلوں گا،لیکن کیا کرتا مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔'' عبارت میں دو جگہ ''میں''اور ایک جگہ''مجھے'' آئے ہیں۔یہ تینوں الفاظ غیر ضروری اور زائد ہیں۔اس کو یوں لکھتے؛''میں نے کہا ضرور تھا کہ تمھارے ساتھ چلوں گا،لیکن کیا کرتا،فرصت ہی نہیں ملی۔''زائد الفاظ یا لفظوں کی تکرار عبارت کے حسن کو کھا جاتے ہیں۔خاں صاحب کے نزدیک اچھی عبارت کے لیے لفظوں کی کفایت شعاری اور زائد الفاظ کا اخراج ضروری ہے۔غیر ضروری لفظوں کی تکرار عربی ،فارسی کے دقیق الفاظ اور انگریزی الفاظ کے بے جوڑ پیوند عبارت کے لیے بہتر نہیں۔ایسے الفاظ جو ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہوں،جیسے''صرف''،''فقط''اور''ہی''ان کو ایک ساتھ لکھنا مناسب نہیں،۔مثلاً ''صرف میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں۔''اس جملے میں'' صرف ''اور''ہی''میں سے ایک لفظ زائد ہے۔جملہ اگر یوں لکھا جائے؛''میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں''۔یہاں بات مکمل ہو گئی۔اسی طرح''فقط میں ہی نہیں گیا''۔یہاں بھی جملے میں وہی عیب ہے۔''فقط''اور ''ہی''ایک ہی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔''میں ہی نہیں گیا''۔''فقط''کے حذف ہونے سے جملہ اچھا ہو گیا۔اسی طرح فقط،صرف اور ہی کا استعمال علاحدہ علاحدہ کرنا چاہیے۔ایک ساتھ دو ہم معنی لفظوں کا استعمال نہ کیا جائے،ورنہ یہ عبارت کا عیب کہلائے گا۔

لفظ''میں'' کا جملوں میں بے جا استعمال یعنی غیر ضروری طور پر لانا ٹھیک نہیں۔مثلاً ''ہم گھر میں گئے تھے۔''۔''تم شام میں آئے تھے۔''''ہم ان کے ساتھ میں تھے۔''اگر ان جملوں کو اس طرح لکھا جائے''ہم گھر گئے تھے''،''تم شام کو آئے تھے''،''ہم ان کے ساتھ تھے۔''یہ زیادہ بہتر ہے۔''میں'' کے اخراج سے جملوں میں روانی اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔خاں صاحب یہاں ''میں'' کو زائد لفظ گر دانتے ہیں اور اس طرح کے جملوں کو انگریزی تراجم بتاتے ہیں کہ یہ انداز اُردو میں بہتر نہیں۔اسی طرح ''پر'' کا استعمال بہت سی جگہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔جیسے؛میں اسی جگہ پر تھا۔''،''تم وہیں پر بیٹھے تھے۔''''ہم وہاں پر تھے۔''ان جملوں کو یوں لکھیے؛''میں اسی جگہ تھا''،''تم وہیں بیٹھے تھے''،''ہم وہاں تھے۔''یہ جملے اب زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔وہاں پر،یہاں پر،جگہ پر،کہیں پر،کہاں پر،جہاں پر،وہیں پر،کہیں پر وغیرہ کلمے عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔بہتر یہ ہے کہ ان کے ساتھ''پر'' کا استعمال نہ کیا جائے۔اسی طرح بہت سے کلمات میں''پر'' کا استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً تخت پر کرسی پر،میز پر،فرش پر وغیرہ۔ایک غلط روش یہ بھی ہے کہ''وہ تخت کے اوپر بیٹھا تھا،پھر کرسی کے اوپر بیٹھ گیا۔اسی طرح کی عبارت مناسب نہیں۔یہاں پر کے ساتھ''او'' زائد ہے۔یہاں تخت کے اوپر،اور کرسی کے اوپر،کی جگہ اگر ''تخت پر''اور''کرسی پر'' لکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

دہلی اور لکھنؤ والوں کے درمیان مصدر کا اختلاف ہے۔مصدر کے آخر میں ''نا'' آتا

ہے،جس کو مصدر کی علامت کہتے ہیں۔مثلاً آنا،جانا،کرنا، پڑھنا وغیرہ۔جب ان کے ساتھ کوئی اسم استعمال ہوتا ہے،تب یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ مصدر کو کس طرح لکھا جائے۔مثلاً کتاب پڑھنا لکھیں یا کتاب پڑھنی لکھیں۔یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔دہلی والے اسم مونث کے ساتھ ''نی'' لاتے ہیں۔جیسے ''چائے پینی،روٹی کھانی، بات کہنی،رائے دینی'' وغیرہ اور اسم مذکر کے ساتھ ''نا'' لاتے ہیں۔جیسے ''جواب دینا،قلم اُٹھانا،سوال کرنا،کالج جانا'' وغیرہ۔جب کہ لکھنؤ والے عام طور پر مصدر کی علامت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے۔ان کے یہاں اسم مذکر ہو یا مونث، بہر صورت ''نا'' بولا اور لکھا جاتا ہے۔ جیسے؛ کتاب پڑھنا، چائے پینا،روٹی کھانا،رائے دینا اور دعا کرنا وغیرہ۔رشید حسن خاں کے مطابق دونوں صورتیں جائز ہیں،لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ مناسب یہ ہوگا کہ کسی ایک طریقے کو اپنا لیا جائے اور اسی پر عمل کیا جائے۔مثال کے طور پر کوئی صاحب کتاب پڑھنا، یا رائے دینا لکھتے ہیں تو ان کے لیے یہ بہتر نہیں کہ وہ ایک جگہ ''کتاب پڑھنا'' لکھیں اور دوسری جگہ ''دعا کرنی'' یا چائے پینی'' لکھیں۔یعنی خاں صاحب کے نزدیک ایک ہی انداز استعمال ہونا چاہیے۔

بہت سے مقامات پر ''نہیں'' کے ساتھ ''ہے'' یا ''ہیں'' لانا مناسب نہیں۔مثلاً وہ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں،گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔'' اس جملے کو اگر یوں لکھا جائے؛ وہ کہیں آتے جاتے نہیں،گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔'' جملے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ''نہیں ہیں'' میں ''ہیں'' زائد لفظ ہے۔فعل میں جہاں بھی ''نہیں ہیں'' یا ''نہیں ہے'' کا استعمال کیا جائے تو صورت مسولہ میں،اس طرف ضرور توجہ دی جائے کہ ادائے مطلب اور حسن عبارت کے اعتبار سے یہ مناسب ہے کہ نہیں۔اکثر مقامات پر ''نہیں'' اور ''ہے'' یا ''ہیں'' کے ساتھ آنے سے عبارت کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔اس لیے ان الفاظ کا استعمال محتاط ہو کر کرنا چاہیے۔یعنی لکھنے والے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہاں ''نہیں'' کے ساتھ ''ہے'' یا ''ہیں'' لکھنا مناسب ہے یا غیر مناسب۔

جملوں میں مفرد اور مرکب الفاظ جو بھی استعمال میں آئیں،ان کے معنی ضرور معلوم ہونے چاہئیں۔جملوں میں ان کا استعمال کہاں تک ٹھیک ہے اور کہاں غلط ،یہ بات بھی توجہ طلب ہے۔یہ جملہ دیکھیے؛ اہل ہنود کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئیں ہیں۔یہاں ''اہل ہنود'' صحیح ترکیب نہیں''۔اس کی جگہ ''اہل ہند'' ضرور صحیح مرکب ہے۔اس کے معنی ہیں ہندوستان والے۔اس میں تمام ہندوستانی، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ آ گئے۔اس جملے میں ''اہل ہنود'' مناسب نہیں ۔اس لیے یہ لکھنا چاہیے تھا کہ؛ ''ہندوؤں کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئی ہیں۔''

ایک لفظ ''معرکتہ الآرا'' ہے۔اس کے معنی ہیں جس میں اختلافِ رائے بہت ہو۔یہ عربی لفظ ہے۔'' آراء'' جمع ہے ''رائے'' کی۔کسی مضمون کی تعریف میں کہا جائے کہ بڑی معرکتہ الآرا کتاب ہے یا کسی غزل کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہنا کہ بڑی معرکتہ الآرا غزل ہے،درست نہیں، کیوں کہ یہاں بجائے تعریف کے بڑائی ہو گئی۔اس کی جگہ ایک مرکب'' معرکہ آراء'' ہے۔یہاں'' آرا'' فارسی لفظ ہے۔اس کا مصدر ہے آراستن ''معرکہ آراء'' کے معنی ''زبردست، پُر زور'' وغیرہ ہیں۔اس لحاظ سے عمدہ غزل کو معرکہ آراء کہا جا سکتا ہے۔ بہت سی مرکب تراکیب میں الفاظ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔وہ غلط ہے۔مثلاً جیب گریباں'' یہاں جیب کے معنی گریبان کے ہیں۔ یعنی ''جیب و گریباں'' ہوا ''گریباں اور گریباں'' جو غلط ہے۔اس لحاظ سے ''جیب و دامن'' صحیح مرکب ہے۔اس کے معنی ہوئے ''دامن اور گریباں'' یعنی یہ صحیح ترکیب ہوئی۔

رشید حسن خاں صفت کے تین درجے بتاتے ہیں ؛''اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا''۔یہ سب با معنی کلمے ہیں،لیکن ان کا استعمال اگر صحیح جگہ پر نہیں ہوگا تو بے معنی ہو جائیں گے۔خاں صاحب کے مطابق ہر اسم صفت ایک بیان ہے۔جب کوئی اسم صفت جملے میں لکھا جاتا ہے تو وہ ایک بیان ہوتا ہے۔جس کی مکمل ذمے داری لکھنے والے پر عائد ہوتی ہے۔وہ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہر اسم صفت ایک بیان ہے، جب ہم کوئی اسم صفت جملے میں لکھتے ہیں،تو گویا ہم ایک بیان دیتے ہیں ؛جس کی پوری ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔معمولی جلسے کے لیے یہ کہنا کہ عظیم الشان جلسہ تھا ،غلط بیان دینے کے برابر ہے۔معمولی شاعر کے لیے یہ کہنا کہ وہ بہت اچھا شاعر ہے، یا یہ کہنا کہ وہ صاحب طرز شاعر ہے ،جھوٹی گواہی دینے کے ہم معنی ہے۔اسم صفت بہت سے ہیں جیسے؛ اچھا، بُرا، اعلا، ادنا، بے مثال، بے نظیر، عظیم الشان (وغیرہ)۔یہ تحریر میں آتے رہتے ہیں اور گفتگو میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہم ان کو غیر مناسب طور پر استعمال میں لائیں گے،تو اس سے دو بڑے نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ان لفظوں کا مفہوم بگڑ کر رہ جائے

گا۔دوسرے یہ کہ ہماری تحریر میں خرابی پیدا ہو جائے گی اور ہم غلط بیانی کے مجرم قرار پائیں گے۔اگر ہم صفاتی لفظوں کو غیر مناسب طور استعمال کرنے کے عادی بن جائیں گے،تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لی ہے۔یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ جھوٹے کی بات اعتبار کے قابل نہیں رہتی۔''۳؎

درجہ بندی کے اعتبار سے صفت کی ترتیب؛بہ،بہتر،بہترین ہے۔اسی ترتیب میں معنی ہوئے؛اچھا،بہت اچھا،سب سے اچھا۔''بہ''مفرد لفظ ہے،اس کے معنی''اچھا'' ہے۔'بہتر'مرکب لفظ ہے،جو دو الفاظ'بہ'اور'تر'سے مل کر بنا ہے۔'تر'کے معنی''زیادہ'' کے ہیں۔اسی طرح بہتر کے معنی ہوئے''زیادہ اچھا''یا''بہت اچھا''۔مثلاً یہ کہا جائے کہ''یہ کتاب زیادہ بہتر ہے''۔یہاں یہ بات صاف واضح ہو رہی ہے کہ معنی کے لحاظ سے''زیادہ'' زائد لفظ ہے۔کیوں کہ''بہتر'' کے معنی خود ہی''زیادہ اچھا'' کے ہیں۔لفظ''تر''بطور لاحقہ بہت سے الفاظ میں مستعمل ہوتا ہے۔مثلاً بہتر،کم تر،بیش تر،خوب تر،بدتر۔اسی طرح یہ دوسرے لفظ سے مل کر مرکب لفظ بنا ہے۔''تر'' کے معنی ''زیادہ'' کے ہیں۔یعنی بہتر کے معنی''بہت اچھا''کم تر کے معنی''بہت کم''بیش تر کے معنی''بہت زیادہ''خوب تر کے معنی''زیادہ اچھا''اور بد تر کے معنی ہوئے زیادہ برا یا بہت برا۔اس لیے ایسے الفاظ جن کے آخر میں''تر'' کا استعمال کیا گیا ہو،ان الفاظ کے ساتھ ''بہت''اور''زیادہ''لفظوں کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

رشید حسن خاں نے مرکب الفاظ کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ان کے مطابق ''انھی''اصل مرکب لفظ ہے۔یہ''اُن ''اور''ہی'' سے مل کر بنا ہے۔''ہی'' میں ہائے ہوز ہے۔''اُنھی''میں یہی''ہ''دو چشمی''ھ''میں تبدیل ہو گئی ہے۔اس طرح تلفظ آسان ہو گیا۔''ان ہی''میں''ہ'' کی آواز الگ سے نکلتی ہے۔''انھی''میں نون کی آواز''ھ''میں مل جاتی ہے۔یوں دو حرفوں کی علاحدہ علاحدہ آوازیں ایک آواز بن جاتی ہے۔تلفظ کے لحاظ سے لفظ میں سبک پن کے ساتھ ساتھ روانی پیدا ہو جاتی ہے۔اسی طرح''اس ہی''،''وہ ہی''،''یہ ہی''، ''جب ہی''،''تب ہی'' کی جگہ اسی،وہی،یہی، سبھی،جبھی،اور تبھی لکھنا چاہیے۔

جس طرح خاں صاحب نے''ان ہی'' کو''انھی''،''وہ ہی''کو''وہی''اور تب ہی کو ''تبھی'' لکھنے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اصلاً مرکب الفاظ ہیں۔اسی طرح انھوں نے چند الفاظ کو مرکب سے مفرد بنا دیا،جو ان کی قدیم املا تھی اس پر اعتراض کیا۔مثلاً بلکہ،چونکہ،آنکہ، حالانکہ وغیرہ۔ان الفاظ کو بل کہ،چوں کہ،کیوں کہ،آں کہ،اور حالاں کہ لکھنے کے لیے اصرار کیا۔جب کہ یہ قدیم زمانے سے اسی طرح لکھے جا رہے ہیں اور مرکب الفاظ ہیں۔

جملے میں فعل کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔اس کا استعمال صحیح جگہ پر ہونا بہت ضروری ہے۔یہ جملہ غور سے پڑھیں؛یہاں پرسوں بہت بڑا جلسہ ہونے جا رہا ہے۔''یہ جملہ غلط استعمال ہوا ہے۔اس کی جگہ یہ کہا جائے کہ''پرسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا۔'' یا ''پرسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔'' خاں صاحب''ہونے جا رہا ہے''پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ''یہ تو نرا انگریزی کا ترجمہ ہے۔''ایسا ترجمہ اُردو زبان کے مزاج اور اس زبان کے اندازِ بیان سے میل نہیں کھاتا۔

گفتگو ہو یا تحریر دونوں کو روز مرہ کے مطابق ہونا چاہیے۔یعنی اس طرح بولنا اور لکھنا ،جس طرح معیاری اُردو میں بولتے اور لکھتے ہیں۔مثلاً پانی پینا کو''آب پینا'' لکھا جائے تو یہ روزمرۃ کے خلاف ہوگا۔کیوں کہ ہم اُردو والے روز مرہ استعمال میں''پانی پینا''استعمال کرتے ہیں۔اس لیے لکھنے پڑھنے یا گفتگو میں''پانی پینا''ہی استعمال ہونا چاہیے۔یہ درست ہے۔

محاورے کا صحیح اور برمحل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔محاورے میں مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔اس کے استعمال میں اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ جس جگہ اس کا استعمال کیا جا رہا ہے وہ وہاں معنی و مفہوم کے اظہار سے مناسب ہے یا نہیں۔اس محاورے پر غور کیجیے''ناک کٹنا''اس کے معنی ہیں کسی کے آگے ذلیل و خوار ہونا۔اگر کسی کی واقعی ناک کٹ جائے تو یہ محاورہ نہ ہو کر حقیقت ہو جائے گا۔اس صورت میں ہم اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔

خاں صاحب کے مطابق جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھنا چاہیے۔جملۂ معترضہ اس جملے یا عبارت کو کہتے ہیں جو اصل بات کا لازمی جزو تو ہو لیکن اس کو کسی طرح عبارت سے نسبت ہو،اور لکھنے والے کے نزدیک اس کا لکھا جانا بھی ضروری ہو۔جملۂ معترضہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ قوسین میں لکھی عبارت اور قوسین سے باہر کی عبارت میں ربط اور تسلسل بدستور بنا رہے۔بے ربطی پیدا ہونے کی صورت میں عبارت اُکھڑی اُکھڑی ہو جائے گی۔یہ

عبارت میں عیب مانا جائے گا۔عبارت کو قوسین کے ساتھ پڑھا جائے یا بغیر قوسین کے، ربط و تسلسل جوں کا توں بنا رہنا چاہیے۔مثلاً مرزا صاحب نے (جن سے آپ مل چکے ہیں) کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا۔اس عبارت میں ''جن سے آپ مل چکے ہیں' جملۂ معترضہ ہے۔

رشید حسن خاں کے نزدیک دوسری زبانوں مثلاً انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ کے الفاظ جو اُردو زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور جن کا بدل اُردو زبان میں موجود نہیں، مثال کے طور پر، میزائل، آکسیجن، تھرما میٹر، ہائڈروجن، ناول، فلم، ٹیلی ویژن، اسٹیشن، ریفریجریٹر، پینسل، ایٹم، گلاس اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ۔اب اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا الفاظ استعمال کیا جائے تو وہ بہتر نہیں۔جیسے؛لاؤڈ اسپیکر کی جگہ ''آلۂ مکبر الصوت'' یا تھرما میٹر کی جگہ ''مقیاس الحرارت'' الفاظ کا استعمال کیا جائے تو یہ زبان کو مشکل اور بوجھل بنانے کے مترادف ہے۔اب یہ انگریزی الفاظ اُردو زبان کا حصہ ہیں۔اسی طرح، وہ الفاظ جن کے بدل پہلے سے موجود ہیں ان کی جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا جائز نہیں۔اس سے نہ صرف تحریر بلکہ گفتگو بھی عجیب وغریب اور بگڑ جائے گی۔ان انگریزی الفاظ کو غیر ضروری سمجھا جائے گا اور اسے بگڑی ہوئی اُردو کہا جائے گا۔

خاں صاحب نے ایک اور بڑی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام طور پر عوام الناس کرتے آئے ہیں۔جب ہم کسی سے مخاطب ہوتے ہیں یا خط لکھتے ہیں اور وہ صاحب ڈاکٹر یا پروفیسر ہوں، تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لکھنے والا ڈاکٹر اور صاحب دونوں لکھ دیتا ہے، جو غلط ہے۔ یعنی جب نام سے پہلے ''ڈاکٹر'' یا ''پروفیسر'' لکھا گیا تو پھر نام کے بعد صاحب لکھا ہے تو تو نام سے پہلے ''جناب'' لکھنے کی ضرورت نہیں۔مثلاً ''پروفیسر خالد محمود صاحب'' لکھا جائے تو کہا جائے کہ یہاں ''پروفیسر'' اور صاحب میں سے ایک لفظ زائد ہے۔اس کو فقط ''پروفیسر خالد محمود'' یا ''خالد محمود صاحب'' لکھا جائے۔

املا اور تلفظ کے مسائل بھی اہمیت کے حامل ہیں۔اگر لکھنے میں املا کا خیال نہ رکھا جائے تو معنی اور مفہوم کچھ کا کچھ ہو جائے۔اسی طرح تلفظ صحیح نہ ہو تو بعض دفعہ بڑی شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔یہ دونوں ہی مسائل بڑے اہم ہیں اور ان کا رفع ہونا بھی ضروری ہے۔مثلاً لفظ ''گذشتہ'' ہے، اسے ''گزشتہ'' لکھا جائے تو یہ املا کی غلطی ہوئی، یا لکھا تو صحیح ہے ''گذشتہ'' (ذال کے ساتھ) لیکن پڑھنے میں ''گذِشتہ'' پڑھا (ذال کے نیچے زیر)۔یہاں لکھا ہوا صحیح ہے لیکن تلفظ غلط ہو گیا۔جب کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ ''گُذَشتہ'' (گاف پر پیش ذال پر زبر) اکثر لوگ ''توجّہ''، عُلما، اُدبا اور طلبہ پڑھتے ہیں۔جب کہ ان الفاظ کا صحیح تلفظ توجِّہ، عُلَما، اُدَبا اور طلبہ ہے۔

تلفظ کے غلط ہونے سے بہت سی جگہ معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں۔لفظ ''شہید'' کی جمع ''شُہَدا'' ہے (شین پر پیش، ہ پر زبر) جیسے شُہدائے کربلا۔ایک لفظ ''شُہدا'' (سین پر پیش ہ ساکن) ہے۔یہ آوارہ، بدکردار جیسے مفہوم میں آتا ہے۔اس طرح ایک حرف ''ہ'' کو ساکن پڑھتے ہی معنی کچھ کا کچھ ہو گیا۔

''فاضل'' کی جمع ''فُضَلا'' ہے (ف پر پیش ض پر زبر) ایک دوسرا لفظ ''فُضْلہ'' ہے (ف پر پیش ض ساکن)۔اس کا املا مختلف ہے، تلفظ ایک ہے۔''فُضَلا'' کو اگر ''فُضْلہ'' پڑھا گیا تو سارا معنی اور مفہوم ہی بدل جائے گا۔مثلاً سارا فُضلہ خارج ہو گیا۔''یعنی فُضلہ ایسے مادے کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا بے کار یا فاسد مادہ ہو۔جب کہ ''فُضَلا'' کا مطلب کسی میدان میں مہارت رکھنا یا فاضل ہونے کے ہیں۔اسی طرح بہت سے الفاظ ہیں جن کے تلفظ میں بہت گڑبڑی کی جاتی ہے۔مثلاً ان الفاظ کا تلفظ دیکھیں مَرَض، خَلَق، عَرَق اور عِطَر وغیرہ یہ صحیح ہیں لیکن اکثر اشخاص ان کو مَرْض، خَلْق، عَرْق اور عِطْر پڑھتے ہیں جو غلط ہے۔

اس طرح رشید حسن خاں نے علم کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگا کر زبان اُردو کی زلفوں کو سنوارنے کی سعی جمیلہ کی ہے۔بہت سے مسائل کو اپنی محنت شاقہ، لگن، جاں فشانی، ایمان داری، حق پرستی اور علم کی روشنی میں حل کیا ہے۔وہ جب کوئی علمی بحث چھیڑتے تو پھر پرت کی تہہ پر تہہ کھولتے چلے جاتے۔بلا شبہ اُردو زبان و قواعد کے اعتبار سے ان کی اصلاحات اور مشورے قابل احترام ہیں۔یہ اُردو زبان و قواعد کی اصلاحات کا شیدائی، خدائے تدوین اور فاضل محقق، اُردو دنیا کو اپنے علم کی روشنی سے منور کرتے ہوئے 26 رفروری 2006ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔اللہ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

حواشی:

۱۔ رشید حسن خاں، انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011ء، صفحہ 6۔

۲۔ رشید حسن خاں، انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011ء، صفحہ 12۔

۳۔ رشید حسن خاں، انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011ء، صفحہ 36 تا 37

□□□

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں تحقیق وتنقید وتدوین کے حوالے سے

ڈاکٹر ظفر عالم

ایف ۱۴۱، فلیٹ نمبر ۲۰۲

جامعہ نگر، اوکھلا

نئی دہلی

رابطہ: 9935212009

اردو تحقیق کے گیسو سنوارنے میں جن قدآور شخصیتوں کے نام لیے جا سکتے ہیں وہ سر سید احمد خاں ،مولوی عبدالحق ،حافظ محمود شیرانی ،قدرت اللہ قاسم ،قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی ، مالک رام ،مسعود حسن رضوی وغیرہ کے ہیں مگر ان میں ایک اہم اور نمایاں نام رشید حسن کا بھی ہے۔ جنھوں نے اردو تحقیق میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو اپنی مثال آپ ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار اردو ادب کے قدر اول کے محققوں میں ہوتا ہے۔

رشید حسن خاں کی ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق ۱۹۳۰ء ہے۔ وہ یوپی کے شاہجہاں پور کے ایسے گھرانے کے چشم چراغ تھے جن پر مشرقیت کا مکمل غلبہ تھا۔ ان کے والد امیر حسن پولس محکمہ میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے مگر عدم تعاون کی تحریک نے ان پر اس قدر اثر ڈالا کہ سرکاری ملازمت سے ہی برطرفی اختیار کرلی۔ مشرقیت ان پر اس قدر حاوی تھی کہ انگریزی تعلیم کو بھی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے تھے، جس کی وجہ سے رشید حسن خاں کی تعلیمی سلسلے کی ابتدا شاہجہاں پور کے مدرسہ بحرالعلوم سے ہوئی۔ جہاں وہ ۱۹۳۹ء تک زیر تعلیم رہے لیکن درس نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔ گھر کی معاشی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن نے شاہ جہاں پور کی آرڈننس فیکٹری میں ملازمت اختیار کرلی۔ کسی وجہ سے فیکٹری میں ملازموں کی موقوفی کی فہرست سامنے آئی تو اس میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل تھا۔ لہٰذا وہ شہر کے عربی مدرسہ فیض عام میں عربی کے استاذ کی حیثیت سے تدریسی فریضہ انجام دینے لگے لیکن یہاں کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ باریش نہیں تھے۔ تاہم انھیں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اسی دوران اسلامیہ سیکنڈری اسکول میں فارسی عربی کے استاذ کی جگہ خالی ہونے کے سبب انھیں وہاں ملازمت مل گئی ۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک اسی اسکول سے وابستہ رہے۔ اگست ۱۹۵۹ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے دسمبر ۱۹۹۸ء میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے عہدے پر رہتے ہوئے ریٹائر ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام انھوں نے شاہجہاں پور میں گذارے اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اپنا معنوی استاذ مانتے تھے۔ ابتدا میں علامہ نیاز فتح پوری کی تحریروں سے حد درجہ متاثر تھے۔ ان کی تحریروں سے اصول تحقیق کے بہت سے گوشے آشکار ہوئے۔ لیکن مذکورہ معنوی استاذہ کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد نیاز فتح پوری سے عقیدت مندی کی پہلی جیسی بات نہیں رہی۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز "شبلی کا فارسی تغزل" کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون سے ہوتا ہے جو رسالہ نگار لکھنؤ کے مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوتھا لیکن ان کی تحقیق نے اس وقت ادبی حلقے میں زیادہ ہل چل پیدا کی جب فیض کے مجموعہ کلام دست صبا پر ان کا چونکا دینے والا مضمون "دست صبا پر ایک نظر" کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ایک بہترین ناقد کی طرح فیض کی شاعری کے ان تمام محاسن اور معائب کا تنقیدی جائزہ مدلل انداز سے پیش کیا۔ فیض احمد فیض پر ان دوسرا مضمون "فیض اور اس کی شاعری" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے فیض کی شاعری کا کماحقہ جائزہ لیا۔ فیض کی مقبولیت کا سبب وہ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

"ان کو یہ ہمہ گیر شہرت ملی ہے ۱۹۵۱ء کے بعد یونی اس واقعہ اسیری کے بعد جس سے بہت سے لوگ واقف ہوں گے اس سے پہلے وہ شاعر تھے اور ایک محدود لیکن با ذوق حلقے میں ان کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس کے بعد وہ "مجاہد شاعر" بن گئے اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے (ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ) مختلف سطحوں پر اپنے اپنے انداز سے ان کی "مجاہدانہ شہرت" کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان کے کلام کو ان ہی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا اور اسی کی فرمائش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوتا تھا کہ شاعری کی بحث میں اضافی خوبیوں کا ضرورت سے زیادہ دخل رہے۔ شاعر اگر مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پھر اس کی ہر تحریر کے متعلق یہ کہا جاہے گا کہ: "لگا دی ہے خون دل کی کشید" چونکہ ان کو مجاہد کا منصب بخش دیا گیا اس لیے ان کی ہر بات آیت و حدث ہو کر رہ گئی۔ ان کی کمزور سے کمزور نظم کو اردو کی اعلیٰ تخلیق بتایا گیا اور اس آوزہ گری میں معقول اور غیر معقول سبھی لوگ ہم آواز ہو گئے۔ اگر کبھی کسی زبان و بیان کے کسی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو اس کو لفظ پرست، روایت پرست اور رجعت پرست کہا گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اگر کوئی شخص فیض (یا کسی اور ترقی پسند شاعر پر کوئی اعتراض کرتا ہے) تو وہ ترقہ پسندی کا مخالف ہے۔ مخالف ہے تو رجعت پرست ہوا اور رجعت پرستوں کی بات کیوں سنی جائے اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ زبان و بیان پر گفتگو کرنا گھٹیا درجے کا کام قرار پایا۔ اس غلط اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ان شاعروں کو جن کو ضرورت تھی صحیح مشوروں کی۔ اس محرومی نے غلط گوئی کو بڑھاوا دیا اور شاعری معائب سے بوجھل ہو کر اپنے ظاہری حسن کو کھو بیٹھی۔"(۱)

مذکورہ مضامین کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی دوسرے مضامین رقم کیے ہیں جن میں انھوں نے ترقی پسند ادبی نظریہ کی بھر پور تنقید کی ہے۔ "تنقید جانب داری کے اسباب اور اثرات" "زبان و بیان کے بعض پہلو" "غزل اور ترقی پسندی" جیسے مضامین کے ذریعہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی خامیوں کی واضح نشاندہی کی ہے۔ رشید حسن خاں تحقیق و تنقید کے ضمن میں اس بات کے خواہش مند ہیں کہ جس سے کسی فن پارے کا صحیح تعین حقائق پر مبنی ہو وہ خوشہ چینی کے قائل نہیں۔ اپنے افتاد مزاج اور اپنے نقطہ نظر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں اس تنقید اور تدوین کا قطعاً قائل نہیں جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں اس تحقیق کو فکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے پسینے پونچھنے کا انداز ہو۔ کیوں کہ حالات نے اب بیشتر افراد کو دنیاداری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے اس لیے تحقیق کا یہ سادہ اور صاف انداز ان کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے "منفی انداز نظر" کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجران ادب کا ہے۔ میں سادہ واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے مجھے شخص سے دلچسپی نہیں۔ اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دلچسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔"(۳)

اپنے زمانے کی مستند ترین کتابوں میں شامل ہونے والی کتابوں کا بڑی انتہائی عرق ریزی سے مطالعہ کرنے کے بعد کسی کو ملحوظ خاطر رکھے بنا بہت ہی

بے باکی کے ساتھ ان غلطیوں کی نشاندہی کی جن کی مثالیں درج ذیل کتابوں پر شائع ہونے والے مضامین میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً "دیوان غالب صدی ایڈیشن" مرتب مالک رام "تاریخ ادب اردو" جمیل جالبی "اردو شاعری کا انتخاب" محی الدین زوبر "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری "لغت ترقی اردو بورڈ کراچی جیسی نادر کتابوں پر ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ حقائق کی بیانی میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔

"دیوان غالب (صدی ایڈیشن)" جو بطور غالب صدی کے موقع پر شائع کیا گیا جس کے مرتب مشہور مصنف ماہر غالبیات مالک رام ہیں۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت مستند ادیب کی ہے۔ موصوف نے غالب سے متعلق کئی اہم گوشے دریافت کیے ہیں۔ اسی سلسلے کی کڑی مذکورہ کتاب ہے۔ انھوں نے تدوین غالب کے لیے نسخۂ آصفیہ کو ترجیح دی۔ جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ غالب نے اس میں تصحیح کی تھی۔ رشید حسن خاں نے دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کر دیا ہے کہ مصنف نے دیوان غالب کی تدوین میں احتیاط ضرور برتا ہے لیکن اصول تدوین کی کوئی پاسداری نہیں کی۔ اور ساتھ ہی اس بات کی نشاندہی کہ آصفیہ لائبریری میں کو ایسا نسخہ نہیں ہے جس کی تصحیح غالب نے فی نفسہ کی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی مرتب کردہ کتاب "اردو شاعری کا انتخاب" جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب کی خصوصیات گوش گزار کیا کہ ۱۴۲۵ء سے لے کر اس زمانے کے موجودہ ۱۵۰ شعراء کا منتخب بہترین کلام شامل کیا گیا ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کتاب پر اپنی تحقیق و تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ بات سامنے آئی کہ مرتب کردہ مصنف کی تساہل پسندی سے کئی ایسی بڑی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جو تحقیق کے قطعی خلاف ہیں۔ مثلاً کسی دوسرے کے اشعار کو کسی اور شاعر کی طرف منسوب کر دینا۔ شعراء کے حالات زندگی میں سنین کی صحیح سند کا خیال نہ رکھنا اور شاعروں کے اصل ناموں کی طرف توجہ نہ دینا۔ رشید حسن خاں نے محی الدین زور کی گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مرتب کا شمار بھی معروف لوگوں میں ہوتا ہے اس لیے خیال یہ تھا کہ یہ انتخاب اعلا معیار پر پورا اترے گا بلکہ اچھے انتخاب کی صحت مند روایت کی تشکیل کرے گا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح کی خامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مرتب نے تحقیق اور تدوین کے آداب کی پابندی کو قطعاً غیر ضروری سمجھا ہے، صحت متن کے وہ قائل نہیں معلوم ہوتے، ماخذ کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتیا ور واقعات اور سنین کی درستی کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہی نہیں، انھوں نے غضب یہ کیا ہے کہ اشعار کے متن میں من مانی تبدیلیاں کی ہیں دوسروں کی نظموں اور غزلون پر اپنی طرف سے عنوان چسپاں کیے ہیں اور نظموں کی ہیئت کو بھی تبدیل کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔"(۳)

آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری کے زیر نگرانی "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طبع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کا اردو قارئین کو بہت بے صبری سے انتظار تھا۔ لیکن جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اس پر رشید حسن خاں کا تبصرہ شائع ہوا۔ جو کہ اس کتاب کی پزیرائی کے بجائے رسوائی کا سبب بنا۔ دراصل کتاب میں شامل مضامین غلطیوں کا انبار تھا۔ ایک ہی شاعر اور ادیب کے حوالے سے کتاب میں شامل مصنفوں کی مختلف آرا تھیں۔ کسی مقالہ نگار نے کسی ادیب کی پیدائش کی جو تاریخ لکھی تو دوسرے مقالہ نگار نے اسی سن کو سال وفات لکھا۔ اس طرح سے اس کتاب میں مرتب سے دوسری بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں تھیں۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب سے متعلق تبصرے میں لکھا ہے۔

"ہمارے یہاں نامو سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے کچھ مشہور افراد کے نام لکھ کر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ترتیب و تدوین کے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور ہر قسم کی بے احتیاطیوں کے جواز کا منشور بھی ہاتھ آ گیا۔ یہ کتاب اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ دو معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مجنوں گورکھپوری بالترتیب اس کے ڈائریکٹر اور اسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ تنقید میں دونوں حضرات کی جو بھی حیثیت ہو لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پہلی جلد سراسر تاریخی و تحقیقی خشک بیانیوں کا مجموعہ ہے۔ تحقیق میں نہ پسی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں نہ دھلی دھلائی چاندنی۔ نہ اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذکر ہو یا بیدل کی شاعری کا ہر موضوع کو فرضی صاحبزادی کو سمجھایا جا سکے۔ یہ نہایت خشک نسبتاً غیر دلچسپ اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما کاروبار ہے آدمی اسی کا ہو رہے، تب کچھ کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں ہر قسم کی اتنی غلطیاں راہ پا گئیں کہ اب آب حیات کی غلطیاں راہ پا گئیں کہ اب آب حیات کی غلطیوں کو شمار کرنا اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اس کتاب کے ساتھ بھی۔"(۴)

''تاریخ ادب اردو'' اردو کے نامور محقق جمیل جالبی کی کتاب ہے۔جو اردو ادب میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔بطور خاص طلبہ وطلبات اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔موجودہ دور میں بھی اس کتاب کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔لیکن اس کتاب میں بھی رشید حسن خاں نے کئی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔جیسے کئی مقامات پر جمیل جالبی نے حوالہ ہی نہیں دیا ہے اور ان حوالوں کو اولیت دی ہے جو ثانوی زمرے میں شامل کئے جانے کے لائق ہیں۔سنین کے حوالے سے چشم پوشی اختار کی ہے۔بیشتر مقامات پر یہ نہیں معلوم ہو پاتا کی مصنف نے کتاب کے کس ایڈیشن سے استفادہ کیا ہے۔جس کتاب یا ایڈیشن سے مدد لی گئی ہے کیا وہ اعتبار کے قابل ہے۔کتاب میں کہیں اردو کے رشتۂ تولد کو پنجاب سے تو کہیں صوبہ سندھ اور کہیں سرحد کوہستان سے قرار دیا ہے۔مزید یہ بھی اردو کی نشونما بلوچستان سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔مجموعی طور سے وہ یہ ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں کہ اردو کی ابتدا پاکستانی خطے سے ہوئی ہے۔جب کہ کسی بھی ماہر لسانیات نے اردو کا رشتہ اس طرح سے نہیں ثابت کیا کہ اردو کی پیدائش پاکستان کے کسی خطے سے ہوئی ہے۔ ان ساری غلطیوں کی نشادہی کے ساتھ رشید حسن خاں نے مصنف کے کام کو سراہا بھی ہے:

''جمیل جالبی صاحب کی مرتب کی ہوئی یہ تاریخ فرد واحد کی کوشش کا نتیجہ ہے اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ انفرادی کوشش اس پنچایتی پیوند کاری'' سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی (اگر اس کتاب کے آخر میں شامل ضمیموں سے قطع نظر کو روا رکھا جائے)۔کتاب پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولف نے محنت کی ہے۔ان کے نقطۂ نظر اور طریقہ کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے،مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تعلق خاطر کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔''(۵)

رشید حسن خاں تحقیق میں عجلت پسندی کے قائل نہیں ہیں۔تدوین فسانہ عجائب پر اپنا ایک دہائی سے زیادہ عرصہ صرف کرنے کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ایک نسخہ اور ہے تو انھوں نے از سر نو کتاب کی تدوین شروع کی۔ان کی اس دیدہ وری کی اگر داد نہ دی جائے تو بڑی ناسپاسی ہوگی۔کیونکہ تحقیق سے وابستہ ہر فرد اس بات کا بخوبی علم رکھتا ہے کہ اپنے کام کو چند دن نہیں بلکہ آٹھ سے دس سال صرف کرنے کے بعد نئے سرے سے آغاز کرنا پڑے تو قوت حاسہ جواب دے جائیں گے۔اس قسم کا جوہر رشید حسن خاں کی شخصیت کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے۔ان کے خیال کے مطابق جو بھی محقق کسی سہو یا غلط بیانی کو گرفت نہیں کرتا تو یہی آگے چل کر مستند زمروں میں شامل کی جانے لگتی ہیں۔مذکورہ کتاب کے علاوہ ''باغ و بہار،مثنوی گلزار نسیم،مثنویات شوق،مثنوی سحر البیان، مصلحات ٹھگی اور زٹل نامہ جیسی کلاسکی کتابوں کی تدوین کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

رشید حسن خاں نے اہم ادبی کارناموں کے علاوہ اردو املا،الفاظ کی درستگی،زبان وقواعد کی تصحیح،وغیرہ پر بہت غور فکر کرنے کے کچھ اصول وضع کیے جو اردو ادب کے لیے انتہائی کارمد ثابت ہوئے۔اس ضمن میں ان کی تحریر کردہ کتابوں میں ''اردو املا،زبان وقواعد،عبارت کیسے لکھیں،اردو کیسے لکھیں،انشاء اور تلفظ وغیرہ ہیں ساتھ ہی اس سے متعلق انھوں نے کئی مضامین بھی رقم کیے ہیں۔حلانکہ اس سے قبل مولانا احسن مارہروی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس طرف توجہ مرکوز کی تھی۔ان بزرگوں کی کوششوں سے یہ ضرور ہوا کہ صحت الفاظ سے متعلق کچھ اصول ضرور سامنے آئے لیکن مرتب اصول نہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے انتشار دور نہیں کیا جا سکا۔ایسے وقت میں رشید حسن خاں نے اپنی ان تھک کاوشوں کے ذریعہ اردو زبان میں راہ پانے والی غلطیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی سعی کی۔

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رشید حسن خاں نے اپنے حیات کا بیشتر حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزار دیا۔انھوں نے اردو تحقیق میں رائج تن آسانی اور سہل پسندی کی گرفت کی اور اپنے تنقیدی مضامین سے یہ ثابت کر دیا کہ زمانے کا کتنا ہی معتبر اور معزز ادیب کیوں نہ ہو اگر اس کے فن میں خامی ہے،تو اس کی وضاحت ضروری ہے۔یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں کی حیثیت قدر اول کی ہے۔ان کی کاوشوں کو کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

۱۔ نیا دور لکھنؤ دسمبر ۲۰۰۷،ص ۱۳۔۱۴

۲۔ رشید حسن خاں شخصیات اور ادبی خدمات، ص ۱۳۔۱۴ مرتبہ،اطہر فاروقی ماہنامہ کتاب نما۔جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵،۲۰۰۲ء

۳۔ ادبی تحقیق،مسائل اور تجزیہ،رشید حسن خاں، ص ۲۱۵ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،۱۹۹۰ء

۴۔ ایضاً،ص ۲۵۵

۵۔ ایضاً،ص ۲۸۵

□□□

Scanned with CamScanner

تحقیق و تدوین کی مثالی شخصیت رشید حسن خاں

ظہیر حسن ظہیر

ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
رابطہ: 7906195568

اردو تحقیق کو جن فرزندان تحقیق پر بجا طور پر فخر و ناز ہے ان میں رشید حسن خاں کا نام قابل ذکر ہے۔ موصوف کا شمار اردو تحقیق کے معتبر اور مسلم الثبوت محققین میں ہوتا ہے، تحقیق میں ان کی رائے استناد کا درجہ رکھتی ہے اس لیے کہ وہ بڑی محنت و لگن اور جاں فسانی کے ساتھ تحقیق و تدوین کا کام انجام دیتے ہیں، ان کا طریق کار اپنے ہم عصر محققین سے ذرا مختلف ہے۔

رشید حسن خاں تحقیقی کام کسی پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت انجام نہیں دیتے بل کہ ان کو تحقیق و تدوین سے فطری مناسبت تھی اور وہ اسے ذوق و شوق جستجو، روحانی مسرت و بصیرت کا سامان سمجھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کا انداز تحقیق ان محققین سے جو تحقیق کو ایک مجبوری اور بوجھ سمجھتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی برتتے ہیں مختلف اور منفرد ہے، ان کا منفرد تحقیقی انداز ہی ان کی خاص پہچان ہے۔

تحقیق کی جو روایت حافظ محمود شیرانی نے قائم کی تھی اس روایت کو امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود صاحب نے قائم رکھی اور رشید حسن خاں نے اس روایت کو مزید مستحکم کیا۔ انھوں نے اپنے پیش رو محققین سے نہ صرف استفادہ کیا بل کہ ان کے نقش قدم پر چل کر تحقیق و تدوین کے معیار کو بلند کیا اور اس کے اصول و ضوابط کو پورے طور پر برت کر تحقیق و تدوین کا حق ادا کر دیا۔

رشید حسن خاں کسی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں تھے، ان کی تعلیم درس نظامیہ کے مطابق ہوئی تھی، انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی، اپنے ذاتی مطالعہ اور فطری صلاحیتوں کی بدولت جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔ ادبی و علمی تحقیق کے لیے ایک محقق میں جن چیزوں کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے یعنی بالغ نظری، وسعت مطالعہ، کثیر المطالعہ، ہمہ جہت مطالعہ، باریک بینی، قوت حافظہ، قوت استدلال، قوت فیصلہ اور غیر جانب داری وغیرہ یہ تمام اوصاف حمیدہ رشید حسن خاں صاحب میں بخوبی پائی جاتی ہیں۔

رشید حسن خاں کے تحقیقی مقالات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے وسیع النظر اور وسیع المطالعہ تھے۔

Scanned with CamScanner

علم عروض، علم قافیہ، صنائع بدائع، قواعد زبان، اساتذۂ اردو کے مختارات، لکھنؤ اور دہلی کے دبستانی اختلافات، اصلاح سخن، معائب سخن، تذکیر و تانیث، املا اور لغات وغیرہ غرضیکہ ان تمام علوم پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ اپنی کتاب میں ان مسائل و موضوعات پر انھوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے، خصوصاً اردو املا اور قواعد زبان پر انھوں نے کافی زور دیا ہے۔ اس سے متعلق انھوں نے ایک کتاب ''اردو املا'' کے نام سے تخلیق کی جو (1974) میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شائع کی گئی، مذکورہ کتاب میں موصوف نے بڑی آسان زبان اور عالمانہ انداز میں املا کے مسائل پر بحث کی ہے۔ مثلاً اردو میں اگر کہیں اضافت کا زیر آتا ہے تو اسے ضرور لگانا چاہیے، عبارت کی صحیح قرأت اسی وقت ہو سکے گی۔ اس کتاب میں انھوں نے فارسی اور عربی کے بہت سے اردو میں مستعمل الفاظ کے صحیح املا کی نشاندہی کی، وہ تلفظ اور املا پر کافی زور دیتے تھے، اپنی کتاب ''اردو کیسے لکھیں'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''جس طرح بولنے والے کو لفظ کے معنی معلوم ہونے چاہیے، اسی طرح لکھنے والے کو لفظ کا املا معلوم ہونا چاہیے۔ جس طرح ''قلم'' کی جگہ پنسل بولنا صحیح نہیں، اسی طرح 'قلم' 'کلم' لکھنا بھی درست نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص ''پان'' کو ''بان'' کہے تو کہا جائے گا کہ تلفظ بگڑ گیا، اسی طرح اگر ''چونہ'' اور ''کتھہ'' لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ املا غلط ہو گیا، کیوں کہ صحیح املا ''چونا'' اور ''کتھا'' ہے۔''(۱)

اردو ایک مستقل زبان ہے اس لیے اس کے تلفظ اور املا بھی دوسری زبانوں مثلاً عربی اور فارسی کے تلفظ و املا سے الگ ہوگا۔ وہ اردو میں فارسی و عربی کے الفاظ اور تلفظ کو ہو بہو اختیار کر نے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''زبان اور قواعد'' میں لغت، تلفظ اور قواعد شاعری کے موضوع پر گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا تلفظ بس اس طرح صحیح ہے جس طرح ان زبانوں کے لغت میں محفوظ ہے، تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھا جانا چاہیے کہ یہ شخص اردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابل قبول ہیں جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو زبان کے اعتبار اور لغت کے استناد کے مسائل سے دلچسپی نہیں''(۲)

رعایت، مروت اور مصلحت پسندی کو رشید حسن خاں بالکل پسند نہیں کرتے بل کہ صاف گوئی، بے باکی اور بات کو دوٹوک انداز میں کہنے میں یقین رکھتے تھے، اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص خوش ہوتا ہے یا ناخوش، صاف گوئی ان کے ہر جملے سے عیاں ہوتی ہے۔ وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور اگر سچ کی تلاش نہ کی جائے تو تحقیق کا مقصد فوت ہو جائے گا، ان کا ماننا ہے کہ جھوٹ، جھوٹ ہوتا ہے وہ کوئی بھی بولے، جھوٹ اور سچ میں تفریق کرنا ہی تحقیق ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

''میں صاف، سادہ اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں یا منفی، ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے مجھے شخص سے دلچسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دلچسپی ہے، جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے، میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں''(۳)

حقیقت سے آشنائی کا نام تحقیق ہے، ہم جب کسی چیز کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم صحیح صورت حال سے واقف ہوں اور اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوں وہ اتنی معتبر ہوں کہ استدلال کے کام آسکیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس پر استدلال کی بنیاد قائم ہو اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، قیاس پر کوئی ٹھوس اور قابل قبول نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، اصول تحقیق کے بارے میں وہ اپنی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' میں رقم طراز ہیں۔

''کسی امر کی اصل شکل کی دریافت اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ اس سلسلے میں جو شہادتیں مہیا کی جائیں اور جو معلومات حاصل کی جائے، وہ ایسی ہونی چاہیے کہ استدلال کے کام آسکے، تاکہ واقعات کی ترتیب میں صحیح طور پر اس سے مدد ملے اور حدود تحقیق کے اندر نتائج نکالے جا سکیں، اس لیے یہ لازم ہو گا کہ جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے، وہ اس وقت کی معلومات کے مطابق بہ ظاہر حالات شک سے بری ہوں اور جن ماخذ سے کام لیا جائے وہ قابل اعتماد ہوں، غیر متعین، مشکوک اور قیاس پر مبنی

Scanned with CamScanner

خیالات کا مصرف جو بھی ہو،ان کی بنیاد پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے نتائج نہیں نکالے جا سکتے"(۴)

رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے،انھوں نے جدید اصول تحقیق سے بھی استفادہ کیا اور سائنٹفک طریق کار کو بھی اپنی تحقیق میں اپنا یا۔انھوں نے تحقیق کے تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اصول وضوابط بھی مرتب کیے جس سے بعد کے تحقیق کاروں کو مستفید ہو نے کا موقع ملا۔ان کا نقطۂ نظر واضح اور صاف ہوتا ہے،انھوں نے جو بھی کام کیا پوری دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ کیا،وہ سہل الحصول کے قائل نہیں۔

تدوین تحقیق کی ایک شاخ ہے۔تحقیق کی طرح یہ بھی ایک دشوار گزار عمل ہے،تدوین کا کام کرنے والے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اصول تحقیق اور آداب تحقیق سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔رشید حسن خاں کو تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین میں بھی مہارت حاصل تھی۔خصوصاً کلاسیکی تدوین متن میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے اردو تحقیق و تدوین میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے،مولوی عبدالحق کے بعد رشید حسن خاں ہی ایک ایسے تدوین نگار ہیں جنھوں نے کلاسیکی متون کو تدوین کے تقاضوں کے مطابق مدون کیا ہے۔چنانچہ ان کے کام سے متاثر ہو کر پروفیسر گیان چند جین نے صرف انھیں تدوین پیغمبر کہنے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ انھیں خدائے تدوین کہا ہے،انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ زعمائے ادب خوش ہوں گے یا نا خوش وہ فرماتے ہیں۔

"میں انھیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں انھیں خدائے تدوین کہوں گا،گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں"(۵)

یوں تو رشید حسن خاں نے "فسانۂ عجائب "باغ و بہار" گلزار نسیم" مثنویات شوق" کے علاوہ "انتخاب ناسخ" انتخاب سودا" انتخاب شبلی" انتخاب نظیر اکبرآبادی" انتخاب مراثی انیس و دبیر" انتخاب خواجہ میر درد" ترتیب دے کر بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔لیکن "فسانۂ عجائب" باغ و بہار" اور "مثنوی گلزار نسیم" کی تدوین ان کے سب سے اہم کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔تحقیق و تدوین کے علاوہ رشید حسن خاں تنقید میں بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں ،صاف گوئی اور بے باکی ان کی تنقید کا خاص حصہ ہے۔اگر چہ انھوں نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جتنا کچھ لکھا ہے وہ قابل اعتبار ہے ،ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تلاش و تعبیر" (1988) کے نام سے شائع ہوا،جس میں انھوں نے کلاسیکی شعرا کے علاوہ جدید شعرا کے کلام پر بھی بے لاگ گفتگو کی ہے۔

مثنوی "گلزار نسیم" کی تدوین رشید حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ ہے،اس سے قبل اس مثنوی کو پنڈت برج نرائن چکبست نے مرتب کیا تھا،لیکن اس نسخے کی خامی یہ تھی کہ اس میں اول یا آخر میں کہیں بھی سال طباعت درج نہیں۔یہ مثنوی معرکۂ چکبست و شرر کی بنیاد بنی۔بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا،بعد میں اسے رشید حسن خاں نے مرتب کیا اور چکبست کے مرتب کردہ متن سے اور اصل متن سے موازنہ کر کے خامیوں کو درست کیا۔موصوف کو علم عروض میں بھی مہارت حاصل تھی اور زبان و قواعد پر بھی،چنانچہ ایک مصرعہ سے متعلق بحث کرتے ہوئے اور چکبست کی علم عروض سے نا واقفیت اور ان کی کوتاہی کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نسخۂ چکبست میں پہلا مصرع اس طرح ہے:

"اک بلی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ"

اشاعت اول میں "جو" موجود نہیں اس میں مصرع اس طرح ہے۔

"اک بلی جھپٹی چوہے کو بھانپ"

"ظاہر ہے کہ "جو" چکبست کا اضافہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اصل مصرعے کو ساقط الوزن خیال کیا ہو اور یہ خیال خویش وزن پورا کرنے کے لیے "جو" کا اضافہ ضروری سمجھا ہو،یہ ہر صورت یہ اضافہ قطعی طور پر غیر ضروری ہے،مصرع اپنی اصل شکل میں بھی

تدوین تحقیق کی ایک شاخ ہے۔تحقیق کی طرح یہ بھی ایک دشوار گزار عمل ہے،تدوین کا کام کر نے والے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اصول تحقیق اور آداب تحقیق سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔رشید حسن خاں کو تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین میں بھی مہارت حاصل تھی۔خصوصاً کلاسیکی تدوین متن میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے اردو تحقیق و تدوین میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے،مولوی عبدالحق کے بعد رشید حسن خاں ہی ایک ایسے تدوین نگار ہیں جنھوں نے کلاسیکی متون کو تدوین کے تقاضوں کے مطابق مدون کیا ہے۔چنانچہ ان کے کام سے متاثر ہو کر پروفیسر گیان چند جین نے صرف انھیں تدوین پیغمبر کہنے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ انھیں خدائے تدوین کہا ہے۔

بحر کے اندر ہے۔اس اضافے کا حق مرتب کو حاصل نہیں تھا۔ چونکہ اشاعت اول شرر کے سامنے نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اس مصرعے کو اسی طرح نقل کیا جس طرح وہ نسخۂ چکبست میں تھا۔ چوں کہ یہ مصرع ''جو'' کے بغیر بھی باوزن ہے اور ''جو'' کے ساتھ بھی بحر کے اندر رہتا ہے۔ یوں کسی طرح کا شک بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا'' (۶)

رشید حسن خاں کی تدوین متن کے سلسلے میں سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ وہ متن کو ترتیب دیتے وقت تمام جزیات پر نظر رکھتے ہیں ۔تدوین کے تمام اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، جب تک انھیں اطمینان نہیں ہوتا تب تک وہ تمام زاویئے سے غور وفکر کرتے ہیں ۔وہ جلد بازی کے قائل نہیں اس لیے کہ جلد بازی تحقیق و تدوین کے منافی ہے ذرا سی غفلت سے بہت ساری غلطیاں راہ پا جاتی ہیں جیسا کہ چکبست کے مرتب کردہ نسخے میں ہیں۔ چنانچہ چکبست کی تدوین اصول سے بے اعتنائی اور شعر کی قرأت کے سلسلے میں ان سے ہوئی خطا کو اجاگر کرتے ہوئے مرتب کی غیر ذمہ داری کا بھی احساس دلایا ہے۔شعر یوں ہے:

صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

طبع اول میں پہلا مصرع یوں چھپا ہوا ہے:

''صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کے''

چکبست نے اپنے نسخے میں اسے یوں لکھا ہے:

''صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی''

''نئے نسخے کے مرتب (چکبست) کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ متعین کرتے کہ اس مصرعے کی صحیح قرأت ''صاد آنکھوں کی'' ہے یا ''صاد آنکھوں کے'' اس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ یہ معلوم کیا جاتا کہ ''صاد'' مذکر ہے یا مونث۔۔۔''صاد'' مذکر تھا اور ہے، ایسی ایک مثال بھی نہیں ملتی جس کو اس کی تانیث کی

یوں تو رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب'' ''باغ و بہار'' ''گلزار نسیم'' ''مثنویات شوق'' کے علاوہ ''انتخاب ناسخ'' ''انتخاب سودا'' ''انتخاب شبلی'' ''انتخاب نظیر اکبر آبادی'' ''انتخاب مراثی انیس و دبیر'' ''انتخاب خواجہ میر درد'' ترتیب دے کر بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔لیکن ''فسانۂ عجائب'' ''باغ و بہار'' اور ''مثنوی گلزار نسیم'' کی تدوین ان کے سب سے اہم کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تحقیق و تدوین کے علاوہ رشید حسن خاں تنقید میں بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں ،صاف گوئی اور بے باکی ان کی تنقید کا خاص حصہ ہے۔اگر چہ انھوں نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جتنا کچھ لکھا ہے وہ قابل اعتبار ہے ،ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تلاش و تعبیر'' (1988) کے نام سے شائع ہوا، جس میں انھوں نے کلاسیکی شعرا کے علاوہ جدید شعرا کے کلام پر بھی بے لاگ گفتگو کی ہے۔

سند کے طور پر پیش کیا جا سکے، اس بنا پر اس شعر میں ''صاد آنکھوں کے'' لکھا جانا چاہیے تھا'' (۷)

رشید حسن خاں کی تحقیق و تدوین کو جو اعتبار حاصل ہے وہ ان کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے، ایسے محقق خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں جان و تن کی پرواہ نہیں کرتے، ایسے ہی لوگوں میں موصوف کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے تحقیق و تدوین جیسے مشکل کام کو اپنی زندگی کا جز و بنالیا تھا۔ جس حسن و خوبی کے ساتھ انھوں نے تحقیق و تدوین کے کام کو انجام دیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔موصوف ہمیشہ اپنے اس علمی و ادبی کارناموں کی بدولت اردو ادب میں زندہ رہیں گے۔انھوں نے تحقیق و تدوین کے لیے جو اصول و ضوابط بنائے ہیں اس سے آنے والے محققین اور تدوین نگاروں کو خاص مدد ملے گی۔

حواشی

۱۔ رشید حسن خاں، اردو کیسے لکھیں، مطبع: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، اگست 1975، ص-12،13

۲۔ رشید حسن خاں، زبان اور قواعد (پیش لفظ)، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اشاعت ثانی، 1982،ص10

۳۔ اظہار، شمارہ 5، جنوری 1984

۴۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، 2005،ص12

۵۔ ماہنامہ، کتاب نما، رشید حسن خاں نمبر، ص74

۶۔ رشید حسن خاں، اودھ کی نمائندہ مثنوی: گلزار نسیم کی تدوین، مشمولہ، نیا دور، اپریل 1994،ص16

۷۔ رشید حسن خاں، اودھ کی نمائندہ مثنوی: گلزار نسیم کی تدوین، مشمولہ، نیادور اپریل 1994ص19۔20

□□□

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں؛ ہمہ جہت شخصیت

صالحہ صدیقی

ریسرچ اسکالر

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

رابطہ: 9899972265

رشید حسن خاں کی شخصیت اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ان کی تصانیف کی اشاعت نے خود ہی یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ان کی تصانیف نہ صرف عصری عہد کی عکاس ہے بلکہ قاری کے فکری ذہن کے دریچوں کو بھی کھولتی ہے۔رشید حسن خاں کی خدمات کا مطالعہ کرنے سے قبل ان کی سوانح پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔کیونکہ کسی بھی مصنف یا تخلیق کار کو عام انسان سے تخلیق کار بننے میں اس کی ذاتی زندگی، عہد و ماحول اس کے معاشرے کے حالات و واقعات کے اثرات اہم رول ادا کرتے ہیں ۔رشید حسن خاں ۱۹۳۰ میں شاہجہاں پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۲۰۰۶ میں وفات پائی۔

رشید حسن خاں ہندستان کے معروف ماہر لسانیات، محقق و مدون اور شاعر تھے۔انھوں نے کئی اہم اردو مخطوطات کو شائع کرایا۔لیکن ان کی خاص دلچسپی کے موضوعات املا، لغت، قواعد، زبان و بیان تھے۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالات بھی لکھے، جو مجموعوں تفہیم اور تلاش و تعبیر کے نام سے شائع ہوا۔

رشید حسن خاں تدوین و تحقیق کے میدان میں اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں جس کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق نے کیا تھی۔وہ ایک بے بدل عالم و محقق تھے ان کی علمیت، بصیرت و بشارت ان کی ژرف نگاہی برسوں کی ریاضت، وسیع مطالعہ، عملی انہماک اور ان کی یکسوئی کا نتیجہ تھی۔رشید حسن خاں نے لسانی تحقیق کو پوری شد و مد کے ساتھ آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''رشید حسن خاں بھی لسانی موضوعات کے محقق ہیں ۔انھوں نے تحقیق کی معیاری بندی کے لیے اصولوں کی تدوین اور چند تاریخوں کے تسامحات کو جرات مندی سے آشکار کیا۔فنی طوور پر وہ قاضی عبدالودود کے مدرسۂ فکر سے متعلق ہیں اور متشددانہ انداز میں محاسبہ کرتے ہیں۔''(۱)

رشید حسن خاں یوں تو خود کو مولانا امتیاز عرشی کے ''تلمذ معنوی'' سمجھتے تھے لیکن ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہوجاتی ہے کہ انھوں نے تمام اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

Scanned with CamScanner

اس سلسلے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا بیان بہت اہم ہے جو انھوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان رشید حسن خاں (جہان تحقیق کا آفتاب) میں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے۔اس لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی استاد مانتا ہوں۔''(۲)

رشید حسن خاں کی مدونہ کتب میں ان کے اساتذہ کے اثرات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ رشید حسن خاں نے مذکورہ اساتذہ کی روایات میں مفید اور اہم اضافے بھی کیے ۔رشید حسن خاں نے نہ صرف تدوین متن کے بنیادی اصولوں پر کثرت سے مضامین لکھے بلکہ عملی طور پر ترتیب وتدوین کے مثالی نمونے بھی پیش کیے۔رشید حسن خاں کا بیشتر تحقیقی وتدوینی کام، قیام دہلی کے زمانے کا ہے۔فسانۂ عجائب ،باغ وبہار، مثنوی گلزار نسیم، سحر البیان، مثنویات شوق اور زٹل نامہ ان کے مخصوص اسلوب تدوین کے نمونے ہیں ،اس سلسلے میں ڈاکٹر شاذیہ عنبریں لکھتی ہیں:

''رشید حسن خاں نے باغ و بہار (میر امن) فسانۂ عجائب (رجب علی بیگ سرور) گلزار نسیم اور مثنویات کو تحقیق کے جدید اصولوں کی بنیاد اور زبان و بیان کے پختہ مآخذات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا۔ان کی یہ کاوش اردو ادب اور خصوصاً جدید تحقیق میں قابل قدر اضافہ ہے۔''(۳)

اکثر و بیشتر رشید حسن خاں کو حقائق کے نتیجے میں مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ کسی مصلحت کا شکار نہ ہوئے، انھوں نے ہمیشہ سچ کا دامن پکڑے رکھا پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون رشید حسن خاں (جہان تحقیق کا آفتاب) میں ایک بڑا دلچسپ مختصر واقعہ اس سلسلے میں درج کیا، لکھتے ہیں:

''ایک بار کسی مذاکرے میں تدریس کے مسائل زیر بحث تھے ،متعدد نامور اور جلیل القدر اساتذہ بحث میں شریک تھے ۔متن کی قرأت پر سوال ہوا تو کہا ،ابھی جو تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے ،ان میں تلفظ کی کم سے کم بیس غلطیاں میں نے نوٹ کی ہیں۔جب یہ حال ہے تو ہم کیا پڑھائیں گے اور طلبہ کو کیا سکھائیں گے۔'' (۴)

رشید حسن خاں نے تحقیقی اصولوں کی توضیح وتشریح کے لیے ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ ،تدوین، تحقیق روایات انتہائی عرق ریزی سے لکھا۔انھوں نے کلاسیکی ادب کی فرہنگ، مصطلحات ٹھگی اور لغت زبان پر ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' لکھیں۔رشید حسن خاں نے بے شمار تحقیقی مضامین لکھے جن میں نہایت وقیع انداز میں تحقیقی اصول وضوابط کی نشاندہی کی ،اس کے علاوہ تصحیح وترتیب متن کے لیے رسم الخط اور املا کے اصول وضوابط اور ان کے تقاضوں کو واضح کیا۔ان کے تمام تر مدونہ کتب خاص کر مثنویات میں جس قدر اضافہ کیا اس کی مثال اردو دنیا میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی، اس کا اعتراف اہل علم ودانشور بھی کرتے ہیں بقول خلیق انجم:

''اردو میں رشید حسن خاں کے پائے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی پیدا نہیں ہوا۔خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے، وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں۔اس لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''(۵)

رشید حسن خاں ماہرین لسانی محقق ہیں انھوں نے املا کی اہمیت پر بہت زور دیا۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ املا کہ درستی سے ہی ''متن'' کی تصحیح ممکن ہو سکتی ہے۔اس کے لیے وہ قواعد زبان کو مدون کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں، یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''چونکہ مدون کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ زبان ،قواعد بیان ،قواعد شاعری اور اصلاح شاعری زبان کی مختلف تحریکوں سے بخوبی واقف ہو۔اس لیے ایسا شخص اگر ان امور کو نا تمام چھوڑ دے گا یا نظر انداز کر دے گا ،تو یہ صورت اس کتاب کو مجموعی حیثیت سے ناتمامی سے آلودہ کر دے گی اور مرتب کے متعلق بھی کچھ اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہوگا۔''(۶)

رشید حسن خاں کے ضمیموں کی بھی اہمیت مستحکم ہیں۔فسانۂ عجائب اور باغ و بہار اس کی عمدہ مثال ہیں۔فسانۂ عجائب کی نسبت باغ و بہار کے ضمیمے مفصل ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ رشید خاں نے یہاں مختلف نوعیت کی وضاحتوں پر مشتمل معلومات کو ایک ضمیمے میں سمو دیا۔مثلاً فسانۂ عجائب میں تشریحات، اختلاف نسخ ،انتساب اشعار، اور افراد و مقامات وغیرہ کی وضاحت کے لیے الگ الگ ضمیمے ہیں جب کہ باغ و بہار میں یہ ایک ہی ضمیمے میں جمع کر دیا۔''انتساب اشعار'' کے سلسلے میں مقدمے میں لکھا کہ باغ و بہار میں

Scanned with CamScanner

اشعار کی تعداد ایسی نہیں کہ اسے الگ ضمیمے میں رکھا جاتا لیکن ''تشریحات''، ''اختلاف نسخ'' اور افراد و مقامات اور عمارات کے تحت آنے والے مباحث جو تقریباً سو سوا سو صفحے میں آئے ہیں انھیں الگ الگ رکھا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ظفر احمد صدیقی کا نظریہ انتہائی اہم ہے وہ لکھتے ہیں:

''متن کتاب کے بعد ضمیموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دراصل ضمیموں ہی سے مرتب کی جگر سوزی و جاں کاہی اور سلیقہ ترتیب و تدوین کا انداز ہوتا ہے۔ پہلے ضمیمے کا عنوان ہے تشریحات، اختلاف نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں، اس کا سلسلہ ص ۲۵۱ سے شروع ہو کر ص ۳۹۳ تک چلا گیا ہے۔

اس ضمیمے میں اختلاف نسخ کے اندراجات تدوین متن کا کام کرنے والوں کے لیے رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ آج کل تدوین متن کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایک نسخے کو بنیاد بنا کر اسے من و عن کتاب کے طور پر نقل کر دیا جائے اور دوسرے نسخوں کے اختلافات کی نشاندہی حواشی میں کر دی جائے۔ حالانکہ بعض اہل علم کے قول کے مطابق ایسی صورت میں مرتب متن کی حیثیت کاتب یا ناقل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جناب رشید حسن خاں اس سہل نگاری بلکہ غیر عالمانہ روش کے ہرگز قائل نہیں۔ وہ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف پر غور کرنے کے بعد ہی اسے متن میں جگہ دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اعراب کا بھی تعین کرتے جاتے ہیں اور اختلاف نسخ کے ذیل میں اپنی ترجیحات کی وضاحت کر دیتے ہیں تاکہ تلاش و جستجو اور غور و فکر کی جن منزلوں سے وہ گزرے ہیں، اس سے ان کا باذوق قاری بھی پوری طرح واقف ہو جائے۔''(۷)

بہر حال رشید حسن خاں کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے انھوں نے نثری و شعری دونوں ہی صنف میں نئے نئے انکشافات کیے۔ جس عرق ریزی سے انھوں نے اپنے تحقیقی کارنامے انجام دیے اس سے اردو تحقیق کی دنیا میں نئے اضافے ہوئے۔ رشید حسن خاں اردو تحقیق نگاری کا وہ نام ہے جنھوں نے اس کی سمت و رفتار کو نیا موڑ دیا۔ عالمی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ عالمی تنقید کے جدید رجحانات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی لیے ان کی تحقیق و تنقید میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔ تنقید کا قدیم مشرقی انداز انھیں پسند نہ تھا وہ تجزیہ و تحلیل سے کام لینے کے عادی تھے۔ انھوں نے تاعمر بنا کسی مفاد کے اردو کی خدمت اور اس کی آبیاری کیں اور زیادہ وقت تحقیق و تنقید میں گزارا۔ رشید حسن خاں کی خدمات کے مختلف جہات کا جائزہ یقیناً ایک وسیع موضوع ہے، ان کے طویل ادبی سفر کو چند صفحات میں سمیٹنا اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالنا یقیناً ممکن نہیں، کہیں نہ کہیں تشنگی کا احساس باقی رہ جانا فطری عمل ہے۔ پھر بھی میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کر سکوں جس کے لیے میں نے تمہید کے ساتھ اصل موضوع کی طرف رخ کرنا مناسب سمجھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ رشید حسن خاں ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے جو صدیوں میں جنم لیتے ہیں آج بھلے ہی وہ ہمارے درمیان موجود نہ ہوں لیکن ان کی تحریریں ہمیشہ ہم طالب علموں کے لیے مشعل راہ بنی رہیں گی اور نسل در نسل اردو طلباء و طالبات کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ میں اپنی باتوں کا اختتام اقبال کے اس شعر کے ساتھ کرنا چاہوں گی کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۵۔
۲۔ مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، جلد ۲۷، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۔
۳۔ شاذیہ عنبریں، ڈاکٹر، تدوین متن، اصول روایت اور امکانات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸۔
۴۔ ماہنامہ ''اخبار اردو'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جلد ۲۷، شمارہ ۴، ۲۰۱۰، ص ۱۷۔
۵۔ پیش لفظ ''مثنویات شوق'' مرتبہ رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۔
۷۔ ''تدوین و تحقیق کے رجحانات'' مضمون، مشمولہ اردو میں اصول تحقیق جلد اول، مرتبہ ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹۲۔
۸۔ گیان چند جین، ''خدائے تدوین'' مشمولہ ''رشید حسن خاں کچھ یادیں'' مرتبین، ڈاکٹر آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، ص ۴۷۔

□□□

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں کے مشاغل

توصیف بریلوی

ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
رابطہ: 9058296593

رشید حسن خاں بیک وقت اردو کے بہت اہم محقق و مدوّن، ادیب اور دانشور تھے۔ جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا ہر بڑے ادیب سے منوایا۔ وہ اپنے وقت کے نابغۂ روزگار تھے۔ ادب کے علاوہ بھی ان کے بہت سے مشغلے تھے جن میں Sports بالخصوص ہاکی، کافی، وہسکی اور دوستی نبھانا اہم ہیں۔

انسان کے لیے جس طرح تعلیم ضروری ہے ٹھیک اسی طرح جسم کی صحت مندی اور توانائی بھی ضروری ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ صحت مند دماغ کے لیے بھی جسم کا صحت مند ہونا لازمی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے بہت سے طریقِ کار اختیار کئے جاتے ہیں ان میں کھیل کود (Sports) کی اپنی اہمیت ہے۔ تعلیم اور صحت کے متعلق ہندوستانی کرکیٹر کپل دیو کا قول ہے:

Apart from education,you need good health,and for that,you need to play sports. (1)

رشید حسن خاں بھی کچھ شوق رکھا کرتے تھے جن میں ہاکی اور کافی بہت خاص ہیں۔ ایک زمانے میں خاں صاحب ہاکی کے کھلاڑی تھے اور شاہجہاں پور کی ٹیم میں انھوں نے دس سال ہاکی کھیلا تھا۔ اسی وجہ سے انھیں ہاکی کے کھیل سے بہت رغبت تھی۔ ٹی وی، ریڈیو کے علاوہ اسٹیڈیم جا کر بھی ہاکی کے میچ دیکھا کرتے تھے۔ ہاکی سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ان کے خطوط سے بھی لگتا ہے۔ اُن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر تنقیدی نقطۂ نظر سے ہاکی دیکھا کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ اظہار خیال بھی کیا کرتے تھے۔ افسانہ نگار انور خان نے اپنے ایک مضمون میں رشید حسن خاں کے اس وصف پر منحصر ایک خط کا حصہ رقم کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''ایک مشکل یہ بڑھ گئی ہے کہ ہندستان اور پاکستان دونوں میں اس وقت اعلا درجے کا سنٹر ہاف موجود نہیں۔ یہاں اجیت سنگھ کے بعد اور وہاں اختر رسول کے بعد ان دونوں کی سطح کا کوئی سنٹر ہاف نہیں نکلا۔ یہ بڑی اہم پوزیشن ہوتی ہے۔ سارا کھیل اسی محور پر گردش کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اجیت پال میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بیک وقت ڈسٹری بیوٹر بھی تھا اور ڈفنڈر بھی۔اسے خوب معلوم تھا کہ کس وقت کہاں ہونا ہے۔پوزیشن لینے کا یہ احساس اب کم یاب ہے۔یہی خوبی اختر رسول میں تھی۔اب جو سنٹر ہاف ہیں دونوں جگہ وہ جتنے اچھے ڈیفنس کرنے والے ہیں،اتنے اچھے تقسیم کار نہیں۔دوسری مشکل یہ ہے کہ اچھا رائٹ آؤٹ کوئی نہیں ہمارے پاس۔جلال الدین ہوں یا کوئی اور،سب اوسط درجے کے ہیں۔رائٹ آؤٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پچیس گز کی لائن سے ذرا نیچے اتر کر جب گیند پھینکتا ہے تو سارا ڈیفنس ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ لفٹ ہاف بیکار ہوکر رہ جاتا ہے اور لفٹ ہاف کسی ٹیم میں بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔رائٹ اِن اور رائٹ آؤٹ کو کمبائن نہیں ہونے دیتا۔اب ایسے رائٹ آؤٹ نظر نہیں آتے جو مخالف لفٹ ہاف کو اس طرح بیکار کر کے رکھ دیں اور ایسی گیندیں سینٹر میں پھینکیں کہ دونوں فل بیک گھبرانے لگیں۔یہ خوبی ہمارے لفٹ آؤٹ ظفر اقبال میں تھی مگر ان میں ایک خرابی ذرا سی یہ تھی کہ وہ اکثر لفٹ اِن سے کمبی نیشن نہیں بنا پاتے تھے۔خود ہی گیند لے کر نکلنا اور گول کرنا چاہتے تھے۔پھر بھی اور سب سے بہتر تھے۔''(۲)

مندرجہ بالا خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاں صاحب کیسی باریک نگاہ سے ہاکی دیکھتے اور اس پر رائے زنی بھی کرتے تھے۔خاں صاحب صرف ہاکی ہی نہیں بلکہ فٹ بال، کرکٹ، باسکٹ بال اور کبڈی کے بھی شوقین تھے اور ان کے میچ دیکھنے جایا کرتے تھے۔ متفرق کھیلوں میں ان کی دلچسپی اور اس پر رائے زنی اس بات کی غماز ہے کہ خاں صاحب اعلا اور دقیق ذہن کے مالک تھے۔غالباً وہ اردو کے

> ''خاں صاحب کا ایک اور عزیز شوق تھا بڑھیا کوالٹی کی وہسکی۔راقم نے انھیں جموں یونی ورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں یہ شوق فرماتے ہوئے دیکھا۔شام کے وقت جب ہم تینوں (پروفیسر شیام لال کالڑا، ڈاکٹر ایم۔ایل۔پروانہ اور راقم) کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تو گیسٹ ہاؤس کا خانساماں اِن کے کمرے میں برف کے پیس، پانی، سلاد وغیرہ رکھ دیتا۔خاں صاحب اپنے ہاتھ سے خود اپنا پیگ بناتے، گلاس میں وہسکی، پانی اور برف ڈال کر اسے بھر لیتے۔دھیرے دھیرے ایک ایک گھونٹ لیتے اور باتیں کرتے جاتے۔
>
> گفتگو صرف ادبی ہوتی یا کبھی کبھی سیاسی معاملات پر بھی بات چیت کر لیتے۔مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح صبح چائے پیتے ہوئے ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک زیادہ وقفہ لیتے تھے۔ٹھیک اسی طرح خاں صاحب کا وقفہ ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک کافی طویل ہوتا۔تین پیگ سے زیادہ میں نے انھیں کبھی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس دوران وہ کسی دوسرے شخص سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اکلوتے محقق اور مدون ہوں گے جو Sports پر اس حد تک باریک نظر رکھتے تھے۔

مختلف کھیلوں کے ضمن میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''خاں صاحب اپنے زمانے میں ہاکی کے کھلاڑی تھے اس لیے دہلی کے شیوا جی اسٹیڈیم میں ہونے والے ہاکی کے میچ اور امبیڈکر اسٹیڈیم میں فٹ بال کے میچ بھی وہ اتنی ہی پابندی سے دیکھتے تھے۔''(۳)

''خاں صاحب نے خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ہاکی، فٹ بال اور باسکٹ بال کے میچ دیکھتے رہتے ہیں۔''(۴)

حنیف نقوی صاحب سے ایک خط میں یوں فرماتے ہیں:

''معاف کرنا بھائی! اس وقت بہت جلدی میں اس پرزۂ کاغذ پر یہ سطریں لکھ نہیں رہا ہوں، گھسیٹ رہا ہوں۔بات یہ ہے کہ آج D.C.M.فٹ بال ٹورنامنٹ میں ایک معرکے کا فٹ بال میچ ہے اور بس ۲۰ منٹ رہ گئے ہیں، اس لیے بھاگم بھاگ جانا ہے۔اس کی معذرت۔جلدی یوں ہے کہ آپ رسید کے منتظر ہوں گے، ورنہ کل اطمینان سے بھی لکھ سکتا تھا۔''(۵)

ظفر احمد صدیقی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کرکٹ کا فائنل دیکھتا جارہا ہوں اور یہ خط لکھتا جارہا ہوں۔ابھی آسٹریلیائی باری ۲۴۱ پر ختم ہو چکی ہے۔(الحمد للہ) اب شری لنکا کی باری ہے۔ہنومان مہاراج ضرور ان لوگوں کی مدد کریں گے۔آپ بھی آمین کہیے اور راون کی آتما کو پرستا بخشے۔

خط بند کرنے سے پہلے: لیجیے ابھی زلفِ شب تابہ کمر بھی نہیں آپائی ہے کہ راون کی امت جیت گئی، کالوں نے گوروں کو ہرا دیا: واہ واہ!''(۶)

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں تحقیق جیسا دقیق کام کرتے تھے۔جس میں سنجیدگی،صبر اور جگر کاوی کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ Sports میں بھی اِس حد تک دلچسپی لیا کرتے تھے۔مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہاکی کے علاوہ خاں صاحب کو کافی کا شوق تھا بلکہ وہ چائے پر کافی کو ترجیح دیتے تھے۔کافی میں بھی فلٹر والی کافی زیادہ پسند تھی۔وہ دہلی کے مخصوص ریستورانوں یا کافی ہاؤس میں ہی کافی کا لطف لیتے تھے ہر جگہ یا کسی بھی کافی ہاؤس میں جانا انھیں پسند نہ تھا۔ایک بات یہ بھی کہ وہ اکثر کافی ہاؤس میں تنہا ہی پائے جاتے تھے۔

چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''ناشتے سے فارغ ہوکر آٹھ بجے ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے پر واپس نہیں جاتے بلکہ سیدھے دہلی اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں۔یہاں بھی ان کی میز مخصوص ہے جہاں وہ ایک گھنٹہ بیٹھتے ہیں۔کافی ہاؤس کے بیرے ان کے مزاج اور مذاق سے بخوبی واقف ہیں ان سے صرف مسکراہٹ کی زبان میں گفتگو ہوتی ہے۔''(۷)

''شام کو خاں صاحب کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں بھی اسی انداز سے رونق افروز ہوتے ہیں لیکن آپ ہر جگہ ان کو تنہا پائیں گے۔کسی کافی ہاؤس میں نہ وہ کسی کی میز پر جاتے ہیں،اور نہ کوئی دوسرا ان کی میز کی طرف رخ کرتا ہے۔''(۸)

یعقوب میراں مجتہدی کو لکھے گئے ایک خط میں کافی کے متعلق خاں صاحب فرماتے ہیں:

''کافی ضرور دن میں دو بار لینا چاہتا ہوں اور جنوب تو کافی کا مرکز اور مخزن ہے''(۹)

اجیت پال میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بیک وقت ڈسٹری بیوٹر بھی تھا اور ڈفنڈر بھی۔اسے خوب معلوم تھا کہ کس وقت کہاں ہونا ہے۔پوزیشن لینے کا یہ احساس اب کم یاب ہے۔یہی خوبی اختر رسول میں تھی۔اب جو سنٹر ہاف ہیں دونوں جگہ وہ جتنے اچھے ڈیفنس کرنے والے ہیں،اتنے اچھے تقسیم کار نہیں۔دوسری مشکل یہ ہے کہ اچھا رائٹ آؤٹ کوئی نہیں ہمارے پاس۔جلال الدین ہوں یا کوئی اور،سب اوسط درجے کے ہیں۔رائٹ آؤٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پچیس گز کی لائن سے ذرا نیچے اتر کر جب گیند پھینکتا ہے تو سارا ڈیفنس ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ لفٹ ہاف بیکار ہوکر رہ جاتا ہے اور لفٹ ہاف کسی ٹیم میں بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔رائٹ اِن اور رائٹ آؤٹ کو کمبائن نہیں ہونے دیتا۔اب ایسے رائٹ آؤٹ نظر نہیں آتے جو مخالف لفٹ ہاف کو اس طرح بیکار کر کے رکھ دیں اور ایسی گیندیں سینٹر میں پھینکیں کہ دونوں فل بیک گھبرانے لگیں۔

رشید حسن صاحب کافی کے بے حد شوقین تھے اقتباسات سے اِس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کے برعکس وہ علی الصبح لیموں والی چائے اور اس کے بعد سادہ چائے بغیر دودھ اور شکر کے بھی پیا کرتے تھے۔بات چوں کہ مشروبات کی چل رہی ہے تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ خاں صاحب بعض اوقات عمدہ کوالٹی کی وہسکی سے بھی شوق فرماتے تھے لیکن کبھی عادی نہیں ہوئے۔اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''خاں صاحب کا ایک اور عزیز شوق تھا بڑھیا کوالٹی کی وہسکی۔راقم نے انھیں جموں یونی ورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں یہ شوق فرماتے ہوئے دیکھا۔شام کے وقت جب ہم تینوں (پروفیسر شیام لال کالڑا،ڈاکٹر ایم۔ایل۔پرواناؔ اور راقم) کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تو گیسٹ ہاؤس کا خانساماں اِن کے کمرے میں برف کے پیس،پانی،سلاد وغیرہ رکھ دیتا۔خاں صاحب اپنے ہاتھ سے خود اپنا پیگ بناتے،گلاس میں وہسکی،پانی اور برف ڈال کر اسے بھر لیتے۔دھیرے دھیرے ایک ایک گھونٹ لیتے اور باتیں کرتے جاتے۔گفتگو صرف ادبی ہوتی یا کبھی کبھی سیاسی معاملات پر بھی بات چیت کر لیتے۔مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح صبح چائے پیتے ہوئے ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک زیادہ وقفہ لیتے تھے ٹھیک اسی طرح خاں صاحب کا وقفہ ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک کافی طویل ہوتا۔تین پیگ سے زیادہ میں نے انھیں کبھی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔اِس دوران وہ کسی دوسرے شخص سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار یا خانساماں کو خاص ہدایت ہوتی

تھی۔ پروفیسر عابدؔ اور پروانہؔ صاحب دونوں اِس کا شوق رکھتے تھے،مگر احتراماً اِنھوں نے اِس معاملے میں خاں صاحب کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔‘‘(۱۰)

رشید حسن خاں دوستوں کے دوست تھے اور دشمنوں کے دشمن۔جس سے دوستی کی اس سے بخوبی نبھائی اور جس سے دشمنی ہوگئی تو اس کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔جس سے بے تکلف ہوتے اس سے خوش گوار موڈ میں باتیں کرتے لیکن عام طور پر وہ مختصر بات کیا کرتے تھے اور جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔طلباء اور بچوں سے شفقت سے پیش آتے۔ان کے مزاج سے متعلق ایک مضمون میں صدیق الرحمن قدوائی کچھ یوں رقم طراز ہیں:

’’خاں صاحب شاہ جہاں پور کے ہیں اور پٹھانوں کے کسی بڑے اڑیل جرگے سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔دوستوں کی دوستی میں وہ کس حد تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ مجھ جیسے دوستوں کو ہے اور دوشمنوں سے دوشمنی کا اندازہ تو شاید اردو دنیا میں سب ہی کو ہوگا۔ دشمن بنانے کا گر ہمارے زمانے میں ان سے بہتر کسی کو نہیں آتا ان کا قلم بس خون کا پیاسا رہتا ہے۔اگر روشنائی لال ہوکر نہ نکلے تو وہ خاں صاحب کا قلم نہیں‘‘(۱۱)

افسانہ نگار انور خان سے بھی ان کے مراسم بہت گہرے تھے۔وہ جب بھی ممبئی جاتے تو انور خان کے ساتھ ان کا کافی وقت گزرتا تھا۔رشید حسن خاں صاحب انور خان کے افسانوں پر اپنی رائے دیتے اور ان کے افسانوں کو پسند بھی کرتے تھے۔ علاوہ ازیں Sports پر بھی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔دونوں میں مراسم اتنے بڑھ گئے تھے کہ رشید حسن خاں نے اپنی ایک کتاب’’ کلاسکی ادب کی فرہنگ‘‘ کا انتساب انور خان کے انتقال کے بعد ان کے نام کیا۔بعد میں یہ کتاب لاہور (پاکستان) سے بھی شائع ہوئی۔انتساب ملاحظہ فرمائیں:

’’اچھے افسانہ نگار اور بہت اچھے انسانا نور خاں (مرحوم) کی یاد میں‘‘(۱۲)

زیر نظر مضمون میں رشید حسن خاں کے مشاغل اور ان کی دلچسپیوں کو صفحۂ قرطاس پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔اس میں کمی و بیشی کی گنجائش بھی ہوگی کیونکہ میرا یہ مضمون صرف مطالعہ پر مبنی ہے اور اس طرح کے مضمون میں صرف مطالعہ درکار نہیں بلکہ اس شخص (یعنی جس پر مضمون لکھا جا رہا ہو) سے راہ و رسم رہی ہو یا اس کے عہد اور ہم عصروں سے کسی طرح کا تعلق ہو۔رشید حسن خاں کی شخصیت سے اتنا تو پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھے۔

ایک بڑے ادیب، محقق اور مدوِّن ہونے کے ساتھ ساتھ Sports پر ان کی مضبوط گرفت کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ وہ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔اردو ادب پر ان کے احسانات کی وجہ سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔اس مضمون کے ذریعہ ان کی زندگی کے دیگر باب وا کرنے اور ادب کے علاوہ ان کے مشاغل پر اظہار خیال کی کوشش کی گئی ہے۔

حواشی:

1- www.brainyquote.com/quotes/quotes/k/kapildev641708.html?src=t_sports

۲- رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)، مرتبہ: اطہر فاروقی، رسالہ: کتاب نما (خصوصی شمارہ)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۴۸،۴۹

۳- ایضاً ص-۳۹

۴- ایضاً ص-۴۸

۵- رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، پروڈکشن: اردو بک ریویو، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص-۳۳۵

۶- ایضاً ص-۶۹۷

۷- رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)، مرتبہ: اطہر فاروقی، رسالہ: کتاب نما (خصوصی شمارہ)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص-۳۹

۸- رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، پروڈکشن: اردو بک ریویو، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص-۱۰۳۸

۹- رشید حسن خاں کے خطوط (مقدمہ)، مرتبہ: ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، پروڈکشن اردو بک ریویو، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص-۲۶،۲۷

۱۰- رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتبہ: اطہر فاروقی، رسالہ: کتاب نما (خصوصی شمارہ)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص-۳۱

۱۱- کلاسکی ادب کی فرہنگ (پہلی جلد)، مرتب: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص، انتساب

□□□

نامور محقق رشید حسن خاں کو خراج عقیدت

ڈاکٹر سعید گورکھپوری
C 710/1841
ترکمانپور، سلطان خان مسجد
گورکھپور

رشید حسن خاں
(1925-2006)

کل تک جو تم کھلاتے رہے بانکپن کے پھول
وہ ساتھ میں جو لائے تھے سرو سمن کے پھول
تاریخ ادب میں وہ ستاروں کی ہیں مانند
بازار میں جو لائے تھے تم فکر و فن کے پھول

یہ مصنوعی نہیں ہے جو خوشبو سے دور ہوں
ممکن نہیں کہ اہل زباں بے شعور ہوں
آئندہ نسل اس سے کرے اکتساب فن
سب کے لئے وہ مطلع صبح نشور ہوں

مطلب کی اپنے چیز جو چاہے خرید لے
اچھی عبارتوں سے تو مقصد مفید لے
در آئے فصاحت سے نہ عاری کوئی جملہ
ہر صاحب نظر سے ہی مقصد مزید لے

اک تبصرہ نگار تھے اک تجزیہ نگار وہ
راہ ادب کو رکھتے رہے مشکبار وہ
رکھتے تھے یہ شناخت محقق کی ملک میں
اردو زباں کو بخش گئے اعتبار وہ

تنقید ہو، تدوین ہو یا تجزیئے کا فن
سب میں وہ بے مثال تھے سب میں وہ لاجواب
تحقیق میں سدا وہ حوالے میں رہیں گے
پڑھتے رہیں گے لوگ سدا ان کی ہر اک کتاب

کھلتے رہیں گے روز ہی باغ سخن کے پھول
کرتے ہیں شادماں بہت صبح وطن کے پھول
اصلاح تھی زبان کی مقصد میاں سعیدؔ
خوش رنگ اس لئے ہیں یہ گنگ و جمن کے پھول

شام اودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں

عبدالحئی

اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، سی ایم کالج،
دربھنگہ (بہار)
رابطہ: 9453814135

سرزمین ہندوستان تہذیب وثقافت اور مذہبی رنگارنگی کی وہ مقدس ومتبرک دھرتی ہے جس کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کی خوبصورتی اور ثروت مندی کی وجہ سے اسے درجنوں بار غیرملکیوں نے لوٹا اور اس پر حکومت کی۔ ہندوستان کے حصول کے لیے کئی خوفناک کی جنگیں ہوئیں اور لاکھوں انسان اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آخر اس ہندوستان میں ایسا کیا ہے جس کے لیے اتنا سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ اگر ہم تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں گے تو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ یہ دھرتی مختلف مذہب اور اس کے ماننے والوں کی آماجگاہ تو ہے ہی لیکن ان سبھی لوگوں کو ایک جذبہ جو آپس میں باندھے رکھتا ہے وہ ہے ہندوستانیت یا قومیت کا جذبہ۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنیاد پر ہمارا ملک صدیوں سے ہمالیہ کے سائے میں سر اٹھائے کھڑا ہے اور آگے بھی کھڑا رہے گا۔ ہندوستان کے کسی کونے میں چلے جائیں آپ کو وہاں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ملے گا جو جس کی کشش آپ کو اپنی جانب متوجہ کر لے گی۔ یہاں کی زندگی، رہن سہن، طرز معاشرت، رسم ورواج، مذہبی عقائد، شادی بیاہ، تہوار، غرض زندگی کے ہر شعبے میں رنگارنگی بھری پڑی ہے۔ غالب نے اسی تناظر میں شاید کہا تھا :

ہندوستان کی بھی عجب سرزمیں ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے مشرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دور دور

ہندوستان میں کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک سینکڑوں تاریخی مقامات ہیں اور ان سب کا اپنا مقام ہے اور اپنی اہمیت ہے۔

Scanned with CamScanner

تاج محل جہاں محبت کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے وہیں دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ مغل دور کی حسین یادگار ہیں۔ اسی طرح جودھپور کا قلعہ، اجنتا ایلورہ کی گپھائیں، میسور کا قلعہ، چار مینار، وادی کشمیر، دارجلنگ، سکم، گوا، بودھ گیا، جے پور وغیرہ۔ غرض ہندوستان کا ہر شہر اپنے اندر کوئی نہ کوئی کشش اور خوبصورتی رکھتا ہے۔ اس طویل فہرست میں اگر لکھنؤ اور بنارس کو نہ شامل کیا جائے تو ہندوستان کی تہذیبی تاریخ ادھوری سمجھی جائے گی۔ اودھ جس کی شامیں اتنی خوبصورت تھیں کہ لوگ مثالیں دیتے تھے اور بنارس جس کی حسین صبح پر پریزاد بھی مرمٹے اور جہاں کے گھاٹوں پر ایک روحانی سکون کے متلاشی جوق در جوق کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اس صبح کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ ہمارا ملک ہندوستان آج ایسے ہی اتنی ترقی نہیں کر گیا بلکہ اس کی ترقی میں یہاں کے باسیوں کا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا ہے:

''ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ ارباب قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے''۔

دریائے گومتی کے کنارے بسا لکھنؤ زمانہ قدیم سے ہی اپنی تہذیب و ثقافت کے لیے جانا جاتا ہے۔ شہر لکھنؤ ریاست اودھ کا دارالسلطنت بھی تھا اور علم و ادب کا مرقع بھی۔ نواب برہان الملک نے تخت نشینی کے بعد لکھنؤ سے اپنا دارالحکومت فیض آباد منتقل کرلیا۔ بعد میں نواب آصف الدولہ نے 1775 میں لکھنؤ کو دوبارہ ریاست اودھ کا دارالسلطنت بنایا۔ نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کی ترقی و تعمیر کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور اس کے دور حکومت میں ریاست اودھ نے خوب ترقی کی۔ اس کی کوششوں سے لکھنؤ اودھ میں ایک ثقافتی مرکز کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوا۔ لکھنؤ کے نواب ایرانی نسل کے تھے اس لیے یہاں کی تہذیب پر ایرانی اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ 1856 میں ریاست اودھ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آجانے کے بعد یہاں کی تہذیب و تمدن پر ایک مغربی رنگ چڑھا اور ایرانی و ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ برطانوی تہذیب و ثقافت کے اثرات بھی دکھائی دینے لگے۔ دبستانِ لکھنؤ کو اردو شعر و ادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تہذیب اودھ کے زیر اثر تحریر کی گئی داستانوں، ناولوں، افسانوں اور شعری مجموؤں میں قدیم لکھنؤ کی انفرادیت جا بجا نظر آتی ہے۔ یہاں کے رسم و رواج، یہاں کا رہن سہن، یہاں کے میلے ٹھیلے اور یہاں کے محرم اور مختلف تہواروں کا حال پڑھ کر یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اودھ محض تاریخ کا ایک حصہ نہیں رہا ہے بلکہ اودھ نے ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے دور کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر اختر بستوی اپنے مضمون فرماں روایان اودھ کے دور میں تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت میں لکھتے ہیں:

''دیوالی بھی فرمانروایان اودھ کے زمانے میں بڑی رونق اور چہل پہل کا تیوہار ہوا کرتا تھا۔ شہر کی زوردار آرائش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں سارے بڑے محلے دلہن کی طرح سجائے جاتے تھے۔ لکشمی اور گنیش کی پوجا ہوتی تھی۔ چوک پورا جاتا تھا اور دیوالی بھری جاتی تھی۔ گھر کے آنگن میں مختلف رنگ کے چاول وغیرہ سے خوبصورت نقش و نگار بنانے کو چوک پورنا کہا جاتا تھا... تمام گھروں میں چراغاں ہوتا تھا اور ہر طرف آتش بازیاں چھوٹتی تھیں۔ شام کو ہندو مسلمان خواص و عوام گھر سے نکل کر روشنی دیکھنے جاتے تھے۔ دیوالی کے موقعے پر قمار بازی کا رواج عام تھا۔'' (نیا دور لکھنؤ، فروری مارچ 1994)

نواب سعادت خاں برہان الملک، صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، واجد علی شاہ، بیگم حضرت محل وغیرہ نے ریاست اودھ کو اور یہاں کے باشندوں کو وہ سب کچھ دیا جس نے آج بھی اودھ کو زندہ رکھا ہے اور اودھ کا نام لیتے ہی خوش حالی، خوبصورتی اور ثروت مندی کا ایک ایسا نظارہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے جو اب صرف قصے کہانیوں تک محدود ہے۔ اردو کی عظیم داستان رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب اودھ کی تہذیب و ثقافت پر ہی مبنی ہے۔ برصغیر میں اردو ناول کی روایت کو مستحکم کرنے میں تین بڑے ناول نگاروں کے نام آتے ہیں جنھوں نے لکھنوی تہذیب کو اپنے ناولوں میں خصوصی جگہ دی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا محمد ہادی رسوا۔ ان تینوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اودھ کی تہذیب کو اردو داں حلقے میں متعارف کرایا۔ بعد کے برسوں میں قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی اور احسن فاروقی کے لکھنے ناولوں میں بھی پرانا لکھنؤ اپنی پوری آب و تاب

Scanned with CamScanner

کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ فکشن کے علاوہ اگر شاعری کی بات کی جائے تو اودھ اور لکھنؤ کے ذکر نے اردو شاعری کو ایک وقار اور شناخت عطا کی ہے۔ غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ غرض ہر صنف میں اودھ کے شاعروں نے اپنی موثر موجودگی درج کرائی ہے اور لکھنؤ کو وہ شان عطا کی ہے جس کا تصور آج محض خوابوں میں ہی ممکن ہے۔ یہاں کی زبان کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ اردو ادب کو مرصع و مسجع زبان سے آشنا کرنے کا سہرا بھی لکھنو کو جاتا ہے۔ ادب سے ہٹ کر اگر بات کی جائے وہاں کی روزمرہ کی زبان میں بھی جو نفاست اور شائستگی تھی وہ کہیں دوسری جگہ نہیں نظر آتی۔

لکھنؤ والوں کی زبان کے حوالے سے عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب گذشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے:

''اردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں جن کا شرفا و معززین کے مقابلوں میں استعمال کرنا لازمی ہے۔ جناب، جناب والا، جناب عالی، حضرت، حضرتِ والا، حضور، حضور والا، حضور عالی، قبلہ، قبلہ و کعبہ، سرکار اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اردو میں معزز مخاطب کی نسبت حسب درجہ استعمال کیے جاتے ہیں جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہلِ لکھنؤ جانتے ہیں اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے۔'' (ص 369)

لکھنؤ مختلف و متنوع تہذیبی رنگارنگی کا مرقع رہا ہے۔ یہاں کی زندگی ایک مثالی زندگی رہی ہے۔ لکھنؤ جہاں نوابوں کے لیے اور اپنی خوبصورت مرصع زبان کے لیے مشہور رہا ہے وہیں یہاں کی شامیں اپنی رنگینی اور دلفریب نظاروں کے لیے مشہور رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے شام ہوتے ہی غروب آفتاب سے تھوڑا پہلے سے ہی یہاں کے بازاروں میں چہل پہل بڑھ جاتی تھی اور یہاں کی عمارتوں کی بالکونیوں سے خوبصورت اور دلفریب دوشیزائیں اپنے مسحور کن حسن سے ہر آنے جانے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی تھیں۔ نوابوں کے شہر لکھنؤ کے اُس عہد میں ان دوشیزاؤں کی ایک الگ پہچان تھی اور طوائفوں کو بہت مہذب سمجھا جاتا تھا۔ شام میں سڑک کے دونوں اطراف گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کے ہار اور گجرے کی دکانیں سج جاتی تھیں۔ قسم قسم کی مٹھائیوں کی خوشبو اور پھولوں کی مہک ساتھ میں عمارتوں سے جھانکتے خوبصورت حسین چہرے، غرض یہ کہ کسی بھی آنے والے کو بیمار کرنے کا سارا سامان فراہم کر دیا جاتا تھا کہ وہ پھر لکھنؤ کی پھول والی گلیوں کا ہی اسیر ہو کر رہ جائے۔ ان طوائفوں کے گھر میں اعلیٰ خاندان کے لڑکوں کی تربیت ہوتی تھی۔ ساتھ ہی انھیں نوابوں کے محل میں بھی رکھا جاتا تھا، کچھ طوائفوں کو تو انگریز حکمراں اپنے ساتھ برطانیہ بھی لے گئے تھے اور وہاں کی خواتین کو ان طوائفوں نے رقص کی تربیت بھی دی تھی۔ لکھنؤ کی طوائفیں انگریز حکمرانوں اور نوابوں کے محل میں مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کرتی تھیں اور ان کے ساتھ رقص و سرور کی محفلیں بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ یہ طوائفیں نہ صرف یہ کہ رقص میں ماہر ہوتی تھیں بلکہ ان کی آواز بھی بہت سریلی ہوتی تھی۔ طوائفوں کو اس دور میں نہایت قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اودھ کی رنگینی اور تہذیبی شناخت میں ان طوائفوں کا کردار نا قابل فراموش ہے۔

مرزا جعفر حسین اپنی کتاب قدیم لکھنؤ کی آخری بہار میں لکھتے ہیں:

''ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر طوائفوں کی ایک خاموش لیکن گراں قدر خدمت یہ تھی کہ ان کا اس شہر میں جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ تھا۔ ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ایک رنگ میں ڈوب کر وقت گزارنا، مذہبی قید و بند سے آزاد ہو کر محبت و الفت کے میدانوں میں بادہ پیمائی کرنا، تعصب و تنگ نظری سے بچنا اور دور رہنا۔۔۔ روسا و عمائدین کے ساتھ ہم سب سابقہ طوائفوں کے بھی شکر گزار ہیں کہ جن کے چھوڑے ہوئے اثرات کی بدولت ہمارے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کبھی نہیں ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب شمالی ہندوستان میں بہت سے مقامات پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے تو ہمارے شہر میں کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی تھی۔ یہ سب فیض تھا۔ ہمارے بزرگوں کے اخلاق اور ان کی طوائفوں کے اطوار کا۔ (ص 288)

کسی بھی معاشرے کی پہچان اس کی زبان اور رہن سہن سے ہوتی ہے۔ لکھنؤ شمالی ہند میں شعر و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے لیے معاشرے میں قصہ گوئی

Scanned with CamScanner

اور روایتوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب ان لوک کہانیوں اور قصوں سے ترقی کرتا ہے۔ لکھنؤ میں بھی قصہ گوئی کی روایت عام تھی۔ منشی نولکشور قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے ان داستانوں کو شائع کر کے صدیوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ شاعری کی اگر بات کی جائے تو خواجہ حیدر علی آتش، سودا، میر انیس، دبیر، آرزو، انشا، فیروز، مصحفی، جرأت، رنگین، میر خلیق، دیا شنکر نسیم و امانت لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دہلی کے اجڑنے کے بعد شاعروں اور ادیبوں کو لکھنؤ میں پناہ ملی۔ لکھنؤ کی ثقافت اور قدیم تہذیبی رنگ نے نوابوں کے دور میں جہاں عام انسان کو عیش و عشرت کا سامان فراہم کیا وہیں لوگوں کی معاشی فراغت نے نکموں اور عیش و مستی میں ڈوبے رہنے والوں کی بڑی تعداد پیدا کر دی۔ ادھر انگریز گھات لگائے بیٹھے تھے کہ کب مناسب موقع آئے اور وہ اس تاریخی ریاست پر قبضہ حاصل کر لیں۔ لکھنؤ کی عوام رقص و سرور، راگ راگنیوں کے قصے، میلے ٹھیلے، جانوروں کی لڑائیوں اور طوائفوں کے کوٹھے کے سحر میں گرفتار تھی۔ امرا عیش و عشرت میں لگے تھے اور عوام تماش بین تھے۔ بازاری عورتوں کا مرتبہ خاتون خانہ سے زیادہ تھا اور طوائفوں سے رابطے رکھنے والے کو معاشرے میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ایسی صورت حال کسی بھی معاشرے کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب گناہ اور عیش پرستی بڑھتی ہے تو معاشرے پر زوال آجاتا ہے اور یہی لکھنؤ کے ساتھ بھی ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"اِس معاشرے میں خیال کا ارتقا رک گیا۔ امرد پرستی اور تماشے بازی نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہو رہی تھی اور سارا کلچر اس نقطے پر سمٹ آیا تھا۔ سستی جذباتیت پرستی، غیر سنجیدگی، پھکڑ پن اور ابتذال نے ساری دوسری اقدار کو پس پشت ڈال کر خود مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کی انتہا یہ دیکھیے کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں بازاری عورتوں اور ناچنے والے طوائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا۔ نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہوگئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے۔ خیال کے ارتقا کے رک جانے کے عمل کو آپ اس زمانے کی شاعری میں بھی دیکھ لیجیے، ہر سطح پر یہ عمل منفی اقدار کی پیدائش کا موجب بن رہا ہے۔" (پاکستانی کلچر: ڈاکٹر جمیل جالبی، 1997، ص57)

ایسی صورت حال میں یہ تہذیب دھیرے دھیرے زوال پزیر ہونے لگی۔ انگریزوں کا تسلط ہونے کے بعد دربار اور جاگیرداری نظام ختم ہوگیا اور وہ سارے ادارے بند ہونے لگے جو لکھنوی تہذیب کی بنیاد تھے۔ آزادی کے بعد لکھنؤ کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات بالکل ہی تبدیل ہوگئے اور اس طرح یہ تہذیب قصہ پارینہ بن کر رہ گئی لیکن آج بھی قدیم لکھنو کا ذکر ہوتا ہے تو آنکھوں کے سامنے خوابوں کی ایک حسین دنیا کا منظر سامنے آجاتا ہے جو ہندوستان کے سونے کی چڑیا کہلائے جانے کا ضامن تھا۔

اپنے مضمون اودھ کی تہذیب کا عروج و زوال میں انیس انصاری لکھتے ہیں:

"اودھ کے زوال کے پیچھے انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی بھی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں شیعہ سنی اور دیگر ملک کے لوگوں کے بیچ اختلافات ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے سماج میں بکھراؤ پیدا ہوا اور اس کے خراب اثرات آج تک دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مذہب اور دھرم کے کٹر پنتھی رجحان کا اثر ہمارے موجودہ سماج پر بھی پڑ رہا ہے تو اسے کیسے روکا جائے۔ لکھنؤ کی تہذیب آپسی بھائی چارے، نفاست، شرافت نفس، وضع داری، فراخ دلی اور انسانیت کے رجحانات سے عبارت تھی۔ اودھ کی تہذیب کا محض یہ پہلو اسے احترام کے لائق بنانے کے لیے کافی ہے۔ (نیا دور، لکھنؤ فروری مارچ 1994)

ہندوؤں کے لیے مقدس شہر بنارس کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے خوبصورت گھاٹوں اور ڈھیر ساری کشتیوں کی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔ ساتھ ہی کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی نقرئی آوازیں گونجتی ہیں۔ گنگا کے کنارے بسا یہ شہر تاریخ کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں مندر ہیں۔ اس لیے اسے مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ کبیر داس، بھگت روی داس اور تلسی داس کی یہ دھرتی ان معنوں میں بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہاں رقص و موسیقی علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جو عروج حاصل ہوا وہ دوسرے کسی شہر میں نہیں ہوا۔ استاد بسم اللہ خاں، پنڈت روی شنکر، پنڈت ہری پرساد چورسیا، گرجا دیوی جیسے عظیم

Scanned with CamScanner

فنکاروں کا شہر بنارس، شیو کی نگری، دیپوں کا دیس اور علم ومعرفت کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ امریکی مصنف مارک ٹوئن اور چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی اپنی تحریروں میں شہر بنارس کے گن گائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو بھگوان شیو نے ہزاروں برس قبل قائم کیا تھا۔ مہابھارت، ویدک اور جینی دور میں بھی یہ شہر موجود تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کے آنے کے بعد یہاں کئی بڑے مندروں کی تعمیر کی گئی۔

وکی پیڈیا کے مطابق سولہویں صدی میں مسلم مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں وارانسی میں ہندومت کی ثقافتی سرگرمیوں کو کافی فروغ ملا، اس نے شہر میں شیو اور وشنو کے مندروں کی تعمیر میں بھی سرمایہ کاری کی۔ اس سلسلے میں مظہر حسن کی مشہور کتاب 'تاریخ بنارس' (جلد اول 1916) میں بھی یہ تحریر ملتی ہے۔

شاہ اکبر نے خاص توجہ بنارس کے جانب رجوع کی اور ان کے فرمان جاری ہونے کے ساتھ بنارس میں ہنود کے مندر اور پرستش گاہ تعمیر ہونی شروع ہوگئی۔ ہندوؤں کو تیرتھ یاترا کی آزادی حاصل ہونے سے تمام ہندوستان کے دولت مند ہنود اس مقام پر جمع ہوگئے اور اس شہر کی ترقی روز افزوں ہونے لگی۔ مہیشور ناتھ کا مشہور و معروف مندر جس کو شہاب الدین محمد غوری نے مسمار کیا تھا بحکم شاہ اکبر، راجہ مان سنگھ (والی جے پور) نے تیار کرانا شروع کیا اور اختتام کو پہنچایا اسی طور پر دیگر راجگان ہنود نے بھی مکان و مندر تعمیر کرانے شروع کیے۔ (ص 53)

اسی طرح معروف ناقد حقانی القاسمی صاحب شہر بنارس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

''وارانسی میں بھی ایک رمز ہے، رمز اتصال کہ یہ دو دریاؤں ورن اور اسی کا سنگم ہے اور صرف دریاؤں نہیں بلکہ دو دھاراؤں شیو ازم اور وشنو ازم کا بھی امتزاج ہے۔ مذہبی لسانی امتزاجیت کا مظہر یہ شہر ہندوؤں کے لیے ہی نہیں، جین اور بودھ دھرم کے ماننے والوں کے لیے بھی مقدس ہے کہ بودھ ازم کا نقطہ آغاز یہی مقام ہے..... اساطیری اور استعاراتی گھاٹوں کا شہر بنارس شکتی پیٹھ بھی ہے۔ یہاں گنگا میں نہانے سے گناہ دھل جاتے ہیں اور روح کو تسکین ملتی ہے۔ یہ ہندوؤں کا شہر نجات ہے۔'' (مضمون بنارس کی تخلیقی صبح)

اب ایسے شہر کی بات کرنی ہو کچھ لکھنا ہو تو بہت سارے نکات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ اسی بنارس کے لیے استاد بسم اللہ خاں نے کہا تھا کہ ''پوری دنیا میں کہیں چلے جائیں ہندوستان دکھائی دیتا ہے اور پورے ہندوستان میں کہیں جائیں انھیں صرف بنارس نظر آتا ہے۔'' بنارس صدیوں سے تہذیب وتمدن اور امن وآشتی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم سے ہی ہندو اور مسلم ساتھ رہتے آئے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ فسادات بھی ہوئے ہیں لیکن پھر بھی دونوں قومیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک رہتی ہیں۔ بنارس کو جہاں ہندوؤں نے ایک مقدس شہر کا درجہ دیا ہے وہیں مسلمانوں نے اقتصادی طور پر اس شہر کو مضبوطی فراہم کی اور بنارس کو بنارسی ساریوں کی وجہ سے ساری دنیا میں پہچان ملی۔ بنارسی ذری ساریوں کے لیے بھی بنارس مشہور رہا ہے۔ بنارس کی بات ہو اور یہاں کے پان کا ذکر نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ بنارس کا پان بھی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ معروف گلوکار کشور کمار نے '' کھئے کے پان بنارس والا'' نغمہ گا کر بنارس کے پان کو اور بھی امر کر دیا۔ اس گانے کو معروف اداکار امیتابھ بچن پر فلمایا گیا ہے۔ ان کے انداز اور رقص نے بھی سب کا من موہ لیا تھا اور یہ گانا آج بھی بہت مقبول ہے۔

بنارس ہے ہی ایسا شہر کہ جو ایک بار یہاں آیا وہ یہیں کا ہوکر رہ گیا۔ یہاں کی صبح کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ گنگا کی گود سے نکلتے سورج اور گنگا کے متبرک پانی میں اشنان کرتے لوگ، کشتیوں پر خوبصورت نظارے کو قید کرتے سیلانی، ساتھ میں پرندوں کی سریلی آوازیں اور گھاٹوں پر آرتی اور مندر کی گھنٹیوں کی آواز ایک ایسا مسحور کن نظارہ پیش کرتی ہیں جو ہر آنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیں۔ جوش ملسیانی نے صبح بنارس کو رشک نور سے تعبیر کیا تو علی سردار جعفری نے پاکستان سے دوستی کے لیے صبح بنارس کی روشنی لے کر آنے کی بات کہی۔ ایرانی شاعر شیخ علی حزیں کو تو بنارس سے ایسا عشق ہوا وہ آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے اور ان کا یہ شعر آج بھی بنارس کے پرانے اردو والے بڑے ذوق وشوق سے سناتے ہیں۔

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

بنارس نے اردو کو آغا حشر کشمیری، مسعود اختر، پریم چند، مولوی مہیش پرشاد، فرخ بنارسی، نذیر بنارسی جیسے تخلیق کار و ناقد عطا کیے۔ اسی طرح ہندی میں بنارس کے ساتھ بھارتیندو ہریش چندر، رام چندر شکل، ہزاری پرساد اور

Scanned with CamScanner

نامور سنگھ جیسے عظیم ادبا کا نام جڑا ہوا ہے۔

بنارس کو سعادت یار خاں رنگین نے شہر طلسمات کہا ہے، تو غالب نے کعبہ ہندوستان کہہ ڈالا۔ اسی طرح صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، جاںنثار اختر، مسعود اختر جمال، خیر بھوروی، حکیم نیر واسطی، حفیظ بنارسی، نذیر بنارسی وغیرہ نے بنارس کے حوالے سے خوبصورت شاعری کی ہے۔

صبح بنارس مرتبہ عشرت کرت پوری میں درج ہے:

''بنارس ہر دور میں علم فن، حکمت و معرفت کا مرکز رہا ہے۔ اس خاک سے بہت سے دانشور اٹھے ہیں جنھوں نے اپنے چراغ فکر ونظر سے ہندوستان کو منور کیا ہے۔''

(ص 19)

بنارس کی صبح اتنی حسین ہوتی ہے کہ جب گھاٹوں پر کھڑے لوگ نکلے سورج کی پہلی کرن سے روبرو ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گنگا سے ڈھل کر سورج ساری کائنات پر اپنی روشنی پھیلا رہا ہو۔

جاںنثار اختر نے صبح بنارس کے لیے کہا تھا:

میرے تخیل پر برسا گئی رس
خدا رکھے تجھے صبح بنارس

اس طرح محشر بدایونی نے اسے یوپی کا کشمیر کہا ہے۔ نذیر بنارسی نے اپنے کئی اشعار میں بنارس کا ذکر کیا ہے۔ ان کی ایک نظم گنگا کے کنارے کا یہ بند مجھے بہت پسند ہے جو بنارس کی تہذیب وثقافت اور یہاں کی صبح کا خوبصورت بیانیہ بھی ہے:

جیسے کہ نذیر ان راتوں پر قدرت بھی کرم فرماتی تھی
بیدار خدا کر دیتا تھا آنکھوں میں اگر نیند آتی تھی
مندر میں گجر بج جاتا تھا مسجد میں اذاں ہو جاتی تھی
جب چاندنی راتوں میں ہم تم گنگا کے کنارے ہوتے تھے

حفیظ بنارسی کا یہ شعر بھی کافی مشہور ہوا تھا:

کہ جینے کا سامان یہیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں

بنارس پر نذیر بنارسی کا یہ شعر بھی یہاں دینا ضروری ہے:

گھاٹ پر مندروں کے سائے میں
بیٹھ کر دور کر رہا ہوں تھکان
پاس مندر میں بج رہا ہے گجر
دور مسجد میں ہو رہی ہے اذاں
سجدہ وہ بھی بتوں کے جھرمٹ میں
کتنا مضبوط ہے مرا ایمان

معروف ادیب اور شاعر شاد عباسی نے بنارس کی زمین اور یہاں کی گنگا کو ماں سے تشبیہ دی ہے۔

بنارس کی زمین اور یہاں کی گنگا کی مثال ایک ایسی ماں کی ہے جو اپنی آغوش میں آئے کسی بچے سے نفرت نہیں کرتی، وہ سارے بچوں کو اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ گنگا کے ساحل پر کھڑے ہو کر اگر کوئی اگتے سورج کی پوجا کرتا ہے تو کوئی اس کے کنارے بیٹھ کر وضو بھی کرتا ہے۔ اس کے پانی سے کوئی گرونانک کے گرو استھل کو پوتر کرتا ہے تو کوئی اس پانی سے یسوع مسیح کے متبرک بائبل کے رکھنے کی جگہ، اپنے عبادت خانے کو پاک کرتا ہے۔

(بحوالہ مدنپورہ کی انصاری برادری۔ ص۔28)

مشرقی تہذیب وتمدن کے دھندلے نقوش اگر کہیں دیکھنے ہوں تو وہ لکھنؤ اور بنارس میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت پر مسلم حکمرانوں کا غلبہ رہا جبکہ بنارس ہندوؤں کے لیے ہمیشہ سے متبرک اور مقدس شہر رہا ہے لیکن یہاں کی مٹی میں قومی یک جہتی کے عناصر بھی گندھے ملتے ہیں جو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور بنارس کی گنگا اپنے پوتر جل سے سب کو شدھ کرنے کا موقع دیتی ہے۔

لالہ مادھو رام جوہر نے لکھا ہے:

رات دن چین ہم اے رشکِ قمر رکھتے ہیں
شام اودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں

انوار الحسن انوار نے لکھا ہے:

یہ اودھ ہے کہ جہاں شام کبھی ختم نہیں
وہ بنارس ہے جہاں روز سحر ہوتی ہے

غرض یہ کہ ہندوستان کی خوبصورتی اسی رنگارنگی میں پنہاں ہے۔ اسی خوبصورتی اور تہذیبی یگانگت نے آرٹ، موسیقی، رقص، تعمیرات اور علم و ادب کو بیش بہا خزانے دیے ہیں۔

اودھ کی شام اور بنارس کی صبح صدیوں سے مشہور رہی ہے جہاں اودھ کی شام کا تصور اب پہلے جیسا نہیں رہا وہیں بنارس کی صبح آج ہزاروں برسوں کے بعد بھی ویسی ہی ہے اور آج بھی اس صبح کی خوبصورتی میں کمی نہیں آئی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنارس صدیوں سے ایسا ہی ہے اور مختلف سائنسی ترقی اور مال کلچر کے آنے کے بعد بھی یہ نہیں بدلا اور شاید آنے والے برسوں میں بھی بنارس کی صبح کا حسین منظر اور یہاں کا تہذیبی و ثقافتی تنوع قائم رہے گا۔ ہماری تہذیب وثقافت ہی ہماری شناخت ہے اور اسی کے لیے ہمارا ملک ساری دنیا میں مشہور ہے۔

□□□

Scanned with CamScanner

طویل نظم: مختصر جائزہ

ڈاکٹر آفتاب عرشی

ہنسور

امبیڈکر نگر

شاہین باغ، اوکھلا نئی دہلی

رابطہ: 9440936810

قدیم اصناف شاعری قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، شہرآشوب میں اشعار اور بند کی تعداد کے اعتبار سے بہت طویل نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ ایک ہی موضوع کو تسلسل و روانی وضاحت کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن جدید معنوں میں نظم وہ صنفِ شاعری ہے جس کا آغاز حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کے ہاتھوں انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے ہوا۔ جس کی وجہ سے نظم اپنے پورے قد کے ساتھ ایک الگ صنف کی حیثیت سے ابھری۔ عہد حاضر میں اس نے ایسی ترقی کی کہ غزل کے مقابل اگر کسی صنف کو کھڑا کیا جا سکتا ہے تو وہ نظم ہی ہے۔

طویل نظم کی پیدائش رزمیہ شاعری کے بطن سے ہوئی جس کا خمیر قدیم اصناف مثنوی، قصیدہ، ہجو اور شہرآشوب سے اٹھا ہے۔

ہندی شاعری میں رزمیہ نظموں کے لیے ''مہاکاویہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہندی کے مہاکاویہ ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' دنیا کی قدیم ترین اور طویل ترین رزمیہ نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہ سنسکرت زبان کے شاہکار ہیں مگر ہندی اور مراٹھی میں بھی ان کے منظوم ترجمے ملتے ہیں ابھی حال میں ہی مشاعرے کے مشہور ناظم انور جلال پوری نے ''بھاگوت گیتا'' کا اردو منظوم ترجمہ منظر عام پر آیا ہے۔ جس کی اہل نظر نے خوب پذیرائی کی۔

انگریزی ادب میں ''طویل نظم'' Long Poem کے نام سے مستعمل ہے اور رزمیہ شاعری کے لئے ''EPIC'' اصطلاح کا استعمال ہوا ہے۔ اس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو دیگر زبانوں میں رائج ہے۔

طویل نظم ایک ایسی صنف نظم ہے جو موجودہ زندگی کشیدگیوں کو پوری طاقت سے ظاہر کرتی ہے۔ ہم اس نظم کی ہیئت کو روایتی پابندیوں اور آزاد نظم کے اصول وضوابط کی روشنی میں پرکھ نہیں سکتے۔ حالانکہ قدیم دور کی طویل نظموں میں یہ اصول اور ضوابط کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ جو شاعری کی تخلیقی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن بعد کے دور کی نظموں نے طویل نظم کے توسط سے قدیم نظم کے خاکے کو پوری طرح ختم کر دیا ہے۔ اور جدید شاعری کے تحت ایک نئی شعری صنف کے روپ میں طویل نظم کی بنیاد ڈالی ہے۔

Scanned with CamScanner

طویل نظم نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی ایسے انقلابی کام انجام دیے ہیں کہ جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں مغلوں کا خاتمہ اور انگریزوں کا برسراقتدار آنا، ایسے سیاسی حالات تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کا سماجی معاشرہ، سیاست، تعلیم اور مذہب غرض تمام ہی شعبے متاثر ہوئے۔ ایسی صورتِ حال میں زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت پڑی تو طویل نظم پیش پیش رہی بلکہ جدید طویل نظم نے اپنے ابتدائی دور میں ہی یہ ثابت کر دیا کہ اس صنف میں بڑی توانائی ہے۔

قوم کی اصلاح کے مطابق سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ ان کی ترغیب پر ان کے ہم عصر ساتھوں نے بڑی اہم طویل نظمیں کہیں۔ حالی نے طویل نظم ''مدوجزرِ اسلام'' لکھی تو سرسید احمد خاں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

'' یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنفِ نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتمم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور مشاعروں کا ایمان ہے۔ پھر اس قدر موثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے۔'' ۱؎

یہ تبصرہ حالی کی نظم پر سرسید احمد خاں نے کیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ سرسید احمد خاں جیسی دور بین نظر نے یہ بھانپ لیا تھا کہ حالی کے نقشِ قدم پر آنے والے وقتوں میں لوگ ضرور چلیں گے۔ اور وہ اس طرزِ سخن کو ضرور اپنائیں گے۔ یہیں سے اردو شاعری میں ایک نئے شعری انداز کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس دور کے شعراء نے سماج کے مختلف سلگتے ہوئے مسائل کو اپنی طویل نظموں کا موضوع بنایا۔ جس میں رومانی، سماجی، سیاسی، جمالیاتی، تاریخی، معاشرتی، جیسے تمام ہی موضوعات شامل ہیں ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے طویل نظم کی اہمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'' طویل نظم کی بے پناہ وسعتوں کو دیکھتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کاتب تقدیر نے اس کے لیے یہ تحریر کیا تھا کہ یہی صنف زندگی کی حقیقتوں کا پردہ فاش کرے گی۔ انسانیت کے رستے ہوئے ناسوروں کا مرہم تلاش کرے گی۔ یہاں تک کہ حیات وکائنات کا ہر مسئلہ اس کے دامن میں سما جائیگا۔'' ۲؎

اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ طویل نظم زمانے اور انسان کے فطری اور نفسیاتی ضرورتوں کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہے۔

یا پھر ڈاکٹر قاسم امام طویل نظم کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جدید شعراء نے طویل نظم کو نظم کی نئی تکنیک اور دوسری خصوصیت کے ساتھ برتا یعنی نظم طوالت کے باوجود ایک مکمل اکائی کے روپ میں ابھرتی ہے۔ اس کا ارتقاء مصرعہ بہ مصرعہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر بیچ میں کچھ ذیلی باتیں نکل آئیں تو شاعر انہیں سمیٹتا ہوا نظم کے مرکزی خیال کی طرف بڑھتا ہے۔ اس طرح جدید طویل نظم ایک نقطے سے شروع ہو کر بکھرنے اور پھر سمٹ کر مرکزی خیال پر مرتکز ہوتی ہے۔'' ۳؎

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ طویل نظم اپنے سفر میں مرکزی خیال کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔ یا اگر اپنے مرکزی خیال نظم کا بکھراؤ کیسا بھی ہو مگر نظم اپنے مرکزی خیال پر ہی آکر سمٹتی ہے۔

مشہور شاعر و نقاد عمیق حنفی نے طویل نظم کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے:

''طویل نظم محض اپنی طوالت یا مصرعوں کی تعداد کی بنا پر طویل نہیں کہلاتی اس میں ایک منطقی ارتباط بھی ہونا ضروری ہے۔'' ۴؎

ان تمام ماہرین زبان وادب کے نظریات سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ طویل نظم کو ہم نظم کی طوالت کی بنا پر طویل نظم نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ طویل نظم اپنے مرکزی خیال کی بنا پر طویل نظم ہوتی ہے۔ مصرعے و شعر کی طوالت کی بنا پر نہیں۔ اور نہ ہی طویل نظم کے لئے کسی مخصوص ہیئت کو اپنایا گیا ہے بلکہ یہ کسی بھی ہیئت میں کہیں جاسکتی ہیں۔

اردو ادب میں طویل نظم کی مستحکم روایت موجود ہے۔ طویل نظم کے آغاز و ارتقاء پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے دکن میں قلی قطب شاہ کے نظموں کے موضوعات سماج و معاشرے کی عکاسی کرنے والے ہوتے تھے جیسے شب برات، شب معراج، چوگان، بسنت، ہولی وغیرہ کو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئیں ہیں۔ قلی قطب شاہ کے بعد نصرتی، غواصی، وجہی، وغیرہ کی طویل

Scanned with CamScanner

مثنویاں بھی ہمیں دستیاب ہوتی ہیں جو عشقیہ اخلاقی اور سبق آموز موضوعات پر ہوتی تھیں۔ ولیؔ نے بھی قصیدے کے فارم میں طویل نظمیں کہیں ہیں۔

دکن کے بعد شمال میں بھی عہد میرؔ وسوداؔ میں طویل نظم مثنوی، ہجو، مرثیہ اور قصیدے کے روپ میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں۔ میرؔ وسوداؔ کے علاوہ دردؔ، ذوقؔ اور غالبؔ وغیرہ نے بھی ان اصناف پر طبع آزمائی کی۔ مثنوی، قصیدہ، ہجو اور مرثیہ اردو شاعری کی وہ اصناف ہیں جو بہت طویل بندوں پر اور ہزاروں اشعار پر مشتمل لکھی گئی ہیں۔ لیکن خاص کر نظم اور طویل نظم لکھنے کی ابتدا نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء) سے ہوتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی نے طویل نظم کو مثنوی، قصیدہ، ہجو، مرثیہ کے دائرے سے باہر نکالنے کا کام کیا ہے۔ اور طویل نظم کو ایک الگ پہچان دلوائی ہے۔ اس لئے اردو شاعری میں طویل نظم کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی کو موجد ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ نظیر وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی پوری صلاحتیں طویل نظم کو بنانے وسنوانے میں صرف کردی۔ اس لئے موضوعات کی جتنی رنگارنگی نظیرؔ کے یہاں ملتی ہے کسی اور شاعر کے پاس نہیں ملتی۔ نظیرؔ نے طویل نظم کو ایک وسیع کینوس عطا کیا۔ ان کی نظموں میں عام ہندوستانی کا دل دھڑکتا ہے۔ جس میں ہندوستان کی تہذیب معاشرت طرز زندگی، تیج تہوار، چرند، پرند، موسم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کوئی اٹھارویں صدی کی ہندوستانی تہذب کو قریب سے دیکھنا ہو تو نظیر کی شاعری پڑھ لیں۔ ان کی طویل نظموں کے عنوانات کچھ اس طرح سے ہیں برسات کی بہاریں، عید، شب برات، ہولی، دیوالی، موسم، بہار، پت جھڑ، کنہیاجی راس، ککڑی والا، آدمی نامہ، روٹی نامہ، راکھی کا تہوار کلجگ، بنجارہ نامہ، شہر آشوب، تربوز، تاج گنج، خدا کی پہچان، اہل دنیا، خوشامد، نیکی اور بدی وغیرہ جیسے موضوعات ہیں نظیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوگ ان سے فرمائش کر کے اشعار کہلواتے اور بہت جلد یہ اشعار یا نظمیں زبان زدعام ہو جاتے۔

بلاشبہ اردو شاعری میں طویل نظم کی بنیاد نظیر اکبرآبادی نے ڈالی اور ایسی ڈالی کہ آگے آنے والوں کے لیے سیدھا وصاف راستہ بن گیا جس پر چل کر وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ طویل نظم جتنی نظیر نے لکھی ہیں شاید ہی کسی اور شاعر نے لکھی ہو۔

جدید نظم نگاری کے حوالے سے انجمن پنجاب تحریک کو بڑی اہمت حاصل ہے اس تحریک کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ شاعری کو گل و بلبل کے نغموں سے باہر نکال کر حقیقت کی دنیا سے روشناس کرانا۔ محمد حسین آزاد (۱۹۳۰ء۔ ۱۹۱۰ء) اور ان کے رفقاء نے یہ بیڑا اُٹھایا۔ اور نظم نگاری کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ آزاد نے خود نظمیں لکھ کر لوگوں کو بتایا کہ ہم شاعری میں نیچر، حقیقت کو چاہتے ہیں۔ ان کی طویل نظموں میں صبح، گنج قناعت، وداع انصاف، دادِ انصاف، شب قدر وغیرہ ان کی قابلِ ذکر طویل نظمیں ہیں جس میں شب قدر (۱۱۵) اشعار ہیں اس نظم میں ربط و تسلسل بھی ہے اور قافیہ کی پابندی کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ آزادؔ کی طویل نظموں میں ہمیں قدرتی مناظر، سبزہ زار پہاڑی، آبشار، پھول کی تازگی، صبح وشام کے دلکش مناظر ملتے ہیں اسی لئے وہ اپنی شاعری کو نیچرل کی شاعری کہتے ہیں۔

آزادؔ کے ہم عصروں میں الطاف حسین حالیؔ (۱۹۳۷ء۔۱۹۱۴ء) نے انجمن پنجاب کے مقاصد کو اپنی شاعری کے ذریعے فروغ دیا ہے اور انجمن پنجاب کے مشاعروں میں اپنی نظمیں سنائی ہیں۔ حالیؔ کی طویل نظموں میں مناجات بیوہ، چپ کی داد، نشاط اُمید، ریل گاڑی، برکھارت، مٹی کا دیا، حب وطن، مناظرہ رحم وانصاف، مناظرہ واعظ وشاعر، مسدس، ننگِ خدمت، دہلی کانفرنس، فلسفہ ترقی، شکوہ ہند تحفت الاخوان وغیرہ طویل نظمیں ہیں جو طویل نظم کے تمام اصول وضوابط پر پوری اُترتی ہیں۔ ان تمام طویل نظمیوں کے علاوہ ان کی بہترین طویل نظم "مدوجزرِ اسلام" ہے جو مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی، جس کی وجہ سے حالی کو "مسدسِ حالیؔ" بھی کہا جاتا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء۔۱۹۱۷ء)

حالی اور آزاد کے بعد طویل نظم نگاری میں اہم نام ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے مزاج میں جدت پسندی ہونے کی وجہ سے انہوں نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کئے۔ انہوں نے سماجی اور تہذیبی عوامل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کی طویل نظموں میں جریدہ عبرت، آثار سلف، مکالمہ سلف وسبو، آبِ زلال، بارش کا پہلا قطرہ، صبح کی آمد، حب وطن، موت کی گھڑی، شعر کیفیت، اکبرآباد موسوم بہ آثار سلف، نوائے زمستاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جس میں سے جریدہ عبرت ۱۲۴۷ اشعار پر مشتمل طویل نظم ہے۔

سید اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶ء۔

۱۹۲۱ء) نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ کلام سے کیا تھا۔ مگر سرکار کے نوکر ہونے کی وجہ سے وہ انگریز حکومت کی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتے تھے اور نہ مغرب تہذیب کی۔ اس لیے انہوں نے طنز ومزاح کا راستہ اختیار کر کے قوم کو بیدار کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ انہوں غزل کے ساتھ تقریباً تمام اصناف نظم پر طبع آزمائی کی۔ ان کی طویل نظمیں برق کلیسا، جلوہ دربار دہلی، مستقبل، ایک سیمیں بدن سے، جنگ نامہ روم وروس اور ایک منظوم خط ہیں جو ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کو بھیجا گیا تھا۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ے) نے زیادہ تر تاریخ اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر وہ بہت کڑھتے تھے۔ اس لیے ان کی طویل نظم 'صبح امید' ہے جس کا موضوع مسلمانوں کا ماضی اور حال ہے۔ یہ طویل نظم مثنوی کے فارم میں لکھی گئی ہیں جس میں کل (۳۵۳) اشعار ہیں۔ یہ نظم ہے مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے 'صبح اُمید' کو زبانوں و اسلوب کے لحاظ سے 'مسدس حالی' پر فوقیت دی ہے۔ شبلی کی دوسری شاہکار طویل نظم 'شہر آشوب اسلام' ہے جس میں مسلمانوں کی تاریخ خاص کر مراکش، فارس اور ترکی کی تاریخی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ شبلی کی دیگر طویل نظموں میں 'مساوات اسلام' 'اور خیر مقدم ڈاکٹر انصاری' شامل ہیں۔

علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) اردو ادب میں طویل نظم کی روایت کو مستحکم طور پر آگے بڑھانے والوں میں اقبال کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان کی طویل نظموں میں مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ذوق وشوق، شکوہ، جواب شکوہ، شمع وشاعر، خضر راہ، دنیائے اسلام، ہمالہ، نوائے مزدور، تصویر درد، والدہ مرحومہ کی یاد میں، طلوع اسلام وغیرہ شامل ہیں۔

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (۱۸۸۲ء ۔ ۱۹۲۶ء) کی بیشتر نظمیں طویل نظموں کے زمرے میں شامل ہوتی ہیں۔ جن میں خاک ہند، فریاد قوم، آوازۂ قوم اور رامائن کا ایک سین وغیرہ اہم ہیں

درگا سہائے سرور جہاں آبادی (۱۸۷۳ء ۔ ۱۹۱۰ء) کی نظمیں اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کو موضوع بنایا۔ ان کی بیشتر نظموں کے مطالعے سے اس دور کی ہندو تہذیب کا اور رسم ورواج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی مشہور طویل نظم "سوز بیوہ" ہے جو چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی دوسری طویل نظم "دنیا کی اجڑی ہوئی محفل" ہے یہ نظم انہوں نے بھری جوانی میں بیوی کے مرنے پر لکھی۔

شبیر حسن خان جوش (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۸۲ء) اپنی رومانی کی وجہ سے "شاعر شباب" بھی کہلاتے ہیں۔ اور "شاعر فطرت" بھی کہلاتے ہیں۔ جوش روسو کے آزاد نظریہ کے حامی تھے اور اس کا پیغام انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے دیا۔ ان کی طویل نظموں میں "نازک اندامانِ کالج سے خطاب" جو ۴۴ر اشعار پر مشتمل ہیں۔ جس میں حسینان کالج سے مخاطبت کی گئی ہے۔ دوسری طویل نظم "بنام قوت وحیات بنام آزادی" ۴۴ر بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ طویل نظم بھی مسدس کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ جو اس وقت کے قومی مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جوش نے ۱۹۲۸ء میں طویل نظم کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ کیا جس کا نام "ملکوں کا رجز" ہے اس نظم میں ذیلی عنوان امریکہ، انگلستان، فرانس، جرمنی، روس، جاپان، ترکی، ایران افغانستان، ہندوستان کے ناموں سے ہیں۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت متعلقہ ممالک کے تہذیب وتمدن معاشی تجارتی اور سیاسی حالات کا تذکرہ ہے۔

وامق جونپوری (۱۹۰۹ء ۔ ۱۹۹۸ء) ابتدا میں رومانی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی طویل نظم میں "مینا بازار" ادبی اہمیت کی حامل ہے جس میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ خامیوں کو واضح کیا گیا ہے۔ وامق جونپوری نے ۱۹۴۴ء میں ایک اور طویل نظم "بھوکا ہے بنگال" تخلیق کی۔ جس میں دوسری عالمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والی مہنگائی اور بے روزگاری کی تباہیوں کو شاعر نے بڑے دل سوز انداز میں پیش کیا ہے۔

اسرار الحق مجاز (۱۹۱۱ء۔۱۹۵۵ء) ایک انتہائی حساس اور حقیقت نگار شاعر تھے۔ حالانکہ ابتداء میں ان کی شاعری پر رومانیت اور جذباتیت کے اثرات ملتے ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے ساتھ ان کی شاعری کا مزاج بھی بدلنے لگا۔ ان کی طویل نظموں میں "رات اور ریل" "نذر علی گڑھ" "آوارہ" "انقلاب و سرمایہ" "خواب سحر" وغیرہ شامل ہیں۔

معین احسن جذبی (۱۹۱۲ء۔۲۰۰۵ء) عموماً غزل گوئی کے لیے مشہور ہوئے لیکن انہوں نے ایک کامیاب طویل نظم "میری شاعری اور نقاد" بھی لکھی ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔

Scanned with CamScanner

علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء) ترقی پسند تحریک کے صفِ اول کے اہم نظم نگار شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ جعفری نے عورتوں اور مزدوروں کے مسائل پر اپنا قلم اٹھایا۔ ''نئی دنیا کو سلام'' ان کی ایک شاہکار تمثیلی نظم ہے جسے اثر لکھنوی نے '' اشتراکیت کا رزمیہ'' کہا ہے۔ نئی دنیا کو سلام کے علاوہ جعفری نے بے شمار طویل نظمیں کہی ہیں جن میں '' نومبر میرا گہوارہ، رومان سے انقلاب تک، فریب جمہور، ہاتھوں کا ترانہ، مشرق و مغرب، ایشیاء جاگ اٹھا ، امن کا ستارہ اور اودھ کی خاکِ حسین'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

احسان دانش (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۸۲ء) نظم نگاری شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ اقبال اور جوش کے ہم عصروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طویل نظم '' دارین'' مسدس کی ہیئت میں لکھی ہوئی ایک کامیاب طویل نظم ہے۔ جس میں ۴۷ر بند شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مزدور کی لاش، دہریت اور اسلام، نوعروس بیوہ، چاندبی بی، ناخواندہ خاتون، مزدور کی دیوار، مزدور کی عید ، مزدور طالب علم، غم فردا، وغیرہ ہیں

جاں نثار اختر (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۷۶ء) کی شاعری میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ اشتراکیت کے علمبردار تھے۔ ان کی ملکی مسائل، سیاست، سماجی تغیرات اور معاشرتی اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے۔ اختر فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے باوجود کبھی پاسبان عقل کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کی طویل نظموں میں'' آخری لمحہ، مزدور عورتیں، پانچ تصویریں، فریب بہار، ریاست دانائے راز، امن نامہ، ستاروں کی صدا، عنوان میرے افسانوں کے، مورخ سے، کارواں، بیزاری، گزرے ہوئے لمحات'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اختر کی ایک طویل نظم'' ایک زخم تمنا اور سہی'' ہے جس میں ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات ، سیاسی حالات، اسی دوران اسٹالن کی موت اور اشتراکیوں پر اس کے اثرات کا اظہار کیا ہے۔

اختر الایمان (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۹۶ء) ترقی پسند تحریک کے اگلے نظم نگار نمائندہ شاعر ہیں۔ انہیں اپنی سماجی اقدار سے بہت پیار تھا۔ 'انسانیت' ان کی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی طویل نظموں میں'' ایک لڑکا، یادیں، کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام، تاریک سیارہ، خاک اور خون، سب رنگ، پرانی فصیل، عہد وفا، بیت لمحات، کوزہ گر، وغیرہ شامل ہیں۔

کیفی اعظمی (۱۹۱۷ء۔ ۲۰۰۲ء) ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ ان کی شاعری میں کم و بیش وہی نظریات ملے گے جو اشتراکی ذہنیت کے شعراء نے موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں مزدور، کسان، فاقہ کش، مفلس و نادار انسانوں پر ہور ہے جبر و استبداد کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا پیغام ساحر کی طرح امن تھا۔ ان کی طویل نظم ''خانہ جنگی'' ۲۱۱ر اشعار پر مشتمل ہے یہ نظم مثنوی کے فارم میں لکھی گئی ہیں۔ خانہ جنگی کے علاوہ کیفی نے ''بیوہ کی خودکشی'' ''میں عورت'' ''لال جھنڈا'' ''جھکار'' وغیرہ طویل نظمیں ہیں۔

جگن ناتھ آزاد (۱۹۱۸ء۔ ۲۰۰۴ء) کی طویل نظمیں شعری حسن کے ساتھ ساتھ سوز و گداز، فرحت و انبساط کے احساس سے معمور نظر آتی ہیں۔ انہوں نے مختلف اہم مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ میرا موضوع سخن، وطن میں اجنبی، اردو، اجنتا کے غاروں میں، ماتم نہرو، وغیرہ ان کی قابل ذکر طویل نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ پہلے وزیر عظم پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر لکھا ہوا شخصی مرثیہ'' ماتم نہرو'' بھی ایک کامیاب طویل نظم ہے۔

عبدالحئی ساحر لدھیانوی (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۰ء) فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری شروع میں رومانیت، دلنوازی، دلبری کے ساتھ سیاسی اور سماجی تصورات بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی طویل نظم پر'' چھائیاں'' کافی مشہور ہوئی۔ ساحر نے اپنی اس نظم کو تجربے کے طور پر دو بحروں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ شعاع فردا، بنگال، پتھر کی دیوار، آج چکلے، میرے گیت، جشن غالب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

نذر محمد راشد (۱۹۱۰ء ۔ ۱۹۷۵ء) ایران میں اجنبی، دل میرے صحرا نورد پیر دل، ابولہب کی شادی، دریچے کے قریب وغیرہ ان کی قابل ذکر طویل نظمیں ہیں۔

مختار صدیقی (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۷۲ء) کی شاعری میں ہمیں ہندوستانی تہذیب و تمدن دھڑکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مختار صدیقی حلقہ ارباب ذوق کے سرگرم رکن تھے۔ ان کی طویل نظمیں ''موہن جودارو، آج ملے، وصال'' ہیں اس کے علاوہ مختار صدیقی کی طویل نظم ''ٹھٹھ'' پاکستان کے معاشرتی حالات کو پیش کرتی ہیں۔

ضیاء جالندھری (پیدائش ۱۹۲۳ء) ان کی طویل نظم'' سالمی'' اور'' ہم'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پنڈت برج نارائن چکبست (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۲۶ء) کی اکثر نظمیں طویل ہیں۔ جن میں خاک ہند، فریاد قوم، رامائن کا ایک سین وغیرہ شامل ہیں۔

Scanned with CamScanner

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء ۔ ۱۹۸۲ء
)اردو طویل نظم نگاری میں حفیظ جالندھیری کا نام نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی نظموں میں کیفیت جذباتی لگاؤ، سرور وکیف نظر آتا ہے۔ ان کی شاہکار طویل نظم شاہنامہ اسلام نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا تھا۔ ان کے علاوہ ان کی طویل نظمیں 'ابھی تو مَیں جوان ہوں' 'کرشن' 'رقاصہ' 'پریت کا گیت' 'چناب' 'اندھی جوانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان موضوعات سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہندوستانی تہذیب اور رسم ورواج سے بہت پیار تھا۔

پنڈت آنند نارائن ملا (پیدائش ۱۹۰۱ء)
کی شاعری قدیم وجدید روایات کا حسین امتزاج ہے ان کی طویل نظموں میں مریم ثانی، اندھی نگری میں دیپ جلیں، بوڑھا مانجھی، ٹھنڈی کافی، زمینِ وطن، وغیرہ ممتاز اہمیت کی حاصل ہیں۔

جمیل مظہری (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۸۰ء) کی نظموں میں ہمیں رومان اور حقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی طویل نظموں میں 'مَیں خدا کے حضور میں' انتقال سے تین مہینے پہلے اور ''گور رسیدہ'' انتقال سے ڈھائی ماہ قبل لکھیں۔ ان کے علاوہ ان کی طویل نظم ''فریاد'' جو (۶۰) بندوں پر مشتمل ہے۔ ان کی شہرہ آفاق نظم ''تول اپنے کو تول'' ہے جس میں فلمی دنیا کی گندگی اور کھوکھلے پن کو انہوں نے بڑے بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔

اختر شیرانی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۴۲ء) جدید رومانی شاعری اختر شیرانی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو سلمٰی، ریحانہ، عذرا پروین اور ناہید جیسی محبوباؤں سے نوازا۔ ان کی تقریباً تمام طویل نظمیں جمالیاتی احساس کو بیدا کرتی ہیں۔ ''اودیش سے آنے والے بتا'' اختر شیرانی کی دل کو چھوتی ہوئی طویل نظم ہے۔

ابن انشاء (۱۹۲۷ء ۔ ۱۹۷۸ء) تقسیم کے حالات کے نتیجے میں پاکستان، لاہور ہجرت کر گئے تھے۔ اپنی شاعری کی وجہ سے وہ 'سادھو شاعر' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کی نظم نگاری میں انفرادیت تھی۔ انشاء کی شاعری کی خصوصیت رومانی اور سلاست تھی۔ ان کی نظموں میں اپنے عہد کا کرب اور زندگی وحیات کی کشمکش ہے جو اس دور کے حالات کی دین ہے۔ ان کی طویل نظمیں ''دیوار گریہ'' ''مضافات'' ''دیوانے کا پاؤں درمیان ہے'' ''امن آخری آدمی'' ''اور یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟'' کا شمار ہوتا ہے۔

سلیم احمد (۱۹۲۷ء۔ ۱۹۸۳ء) نے بارہ سال کی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ لیکن ان کی طویل نظم مشرق نے قارئین کو ان کی جانب متوجہ کیا۔ ان کی اس نظم کا ڈھانچہ دورویوں اور تہذیبوں کی آویزش کے تصور پر قائم کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں ؎

جدید شاعروں میں **سلیم شہزاد** کا نمایاں نام ہے۔ ان کی نظم ''چڑیا گھر'' میں انہوں نے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس نظم میں سلیم شہزاد نے جانوروں کی مختلف حکاتیوں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ کچھوے اور خرگوش، سارس اور لومڑی کی حکایت جیسے موضوعات کے ذریعے انھوں نے اپنے خیالات ونظریات کو پیش کیا ہے۔

قاضی سلیم (۱۹۲۷ء۔ ۲۰۰۵ء) جدید صوفی شاعر کہلاتے ہیں۔ اپنے کلام میں انھوں نے علامتوں کا اظہار بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ ان کی طویل ''مسفٹ'' ''یاوقت کے چاک'' پر اردو ادب کے اہم سرمائے میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی مثنوی ''باغبان ،گل فروش اور زہر خند'' بھی طویل نظم میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئیں ہیں۔ مسفٹ میں قاضی سلیم نے اپنے بھائی کی گمشدگی کے کرب کو پیش کیا ہے۔

سید انصاری حسین حرمت الاکرام (
پیدائش ۱۹۲۸ء) بنیادی طور پر نظم گو شاعر تھے لیکن انھوں نے غزل، رباعی اور گیت پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ''کلکتہ ایک رباب'' ان کی سب سے مشہور طویل ہیں۔ اس نظم میں کلکتہ کی تہذیب وثقافت اور ورواج کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ شاعر اس نظم میں اظہار ذات، جگ بیتی تو کبھی آپ بیتی کے تاریک وروشن پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہو ؎

اک خوشگوار کرب میں کھویا ہوا یہ شہر
جاگا ہوا کبھی ، کبھی سویا ہوا یہ شہر
قاتل لطافتوں میں ڈبویا ہوا یہ شہر
ہنگاموں کی لڑی میں پرویا ہوا یہ شہر
یہ شہر ایک آئینۂ خانہ حیات کا
کہتا ہے روز فسانہ حیات کا

اس نظم کو پڑھنے پر حرمت الاکرام کی کلکتہ سے جذباتی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

عمیق حنفی (۱۹۲۸ء۔ ۱۹۸۵ء) عمیق کی شاعری سادگی اور رومانی ہے۔ ان کی طویل نظمیں ''شہزاد، شب گزشت، ویت نام، سند باد، پتھروں کی آتما، سیاہ گاہ، صوت الناقوس، صلصلۃ الجرس، سبز آگ، اور سرگجا ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ (پیدائش ۱۹۳۰ء)
کی طویل نظموں میں ''فصیل اورنگ آباد، حضارۃ جدید، گلہ صفورہ، خوابوں کی انجمن، خلدا آباد کی سرزمین'' وغیرہ شامل ہیں۔

Scanned with CamScanner

وحید اختر (۱۹۳۵ء۔۱۹۹۶ء) نے اپنی نظموں کے ذریعے سیاسی اور سماجی مسائل کو ابھارا ہے۔ان کی طویل نظمیں ''صحرائے سکوت ،شہر ہوس کی شہید صدائیں میں انھوں نے زندگی کے حقائق کو پیش کیا ہے۔صحرائے سکوت وحید اختر کی سب سے طویل نظم ہے جو چھ ابواب اور تین صفحات پر مشتمل ہیں۔

شکر دت کمار پاشی (۱۹۳۵ء ۔ ۱۹۹۲ء) طویل نظم نگاری میں کمار پاشی بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے مذہبی حکایت پر مبنی ''ولاس یاترا نامی طویل نظم تحریر کی ہے۔اس نظم کا تعلق ہندو دیومالا سے ہے۔جس میں ''کرتی'' کی داستان بیان کی گئی ہیں۔جو کبھی کرونا کی شکل میں سامنے آتی ہے تو کبھی '' کنتھا اور کوشل'' بن کر زندگی کا زہر پیتی ہیں ''کرتی'' ناگراج'' اور پنگی ماں'' کی بیٹی ہے اس نظم میں ''میں'' انسان کے لیے استعمال ہوا ہے۔

زبیر رضوی (پیدائش ۱۹۳۶ء) زبیر رضوی کی طویل نظم ''پرانی بات'' ہے جس میں پرانی نسل کی برائیاں ،نئی نسل کس طرح تاوان دے کر درست کرتی ہیں اس نظم کا لہجہ حکایتی ہے اوراس کے نفسیاتی اور ڈرامائی انداز نے اسے منفرد حیثیت دے دی ہے نظم کے چند مصرعے ہیں:

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
ہوا اک بار یوں
ان کے بزرگوں نے
زمین میں کچھ نہیں بویا
فقط انگور کی بیلیں اگائیں
اور مٹی کے گھڑوں میں مئے بنائی
رات جب آئی
وہ سب مدہوش تھے
ان کے بدن ننگے تھے
پہلی بار مئے کا ذائقہ ہونٹوں نے چکھا تھا
حکایت ہے
برہنہ دیکھ کر اپنے بزرگوں کو
جوان بیٹوں نے آنکھیں بند کر لیں
اور مٹی کے گھڑوں کو توڑ ڈالا
صبح سے پہلے
زمین ہموار کی
اوراس میں ایسے بیج بوئے
جن کے پھل پودے
کبھی ان کے بزرگوں کے نہ کام آئے

یہ نظم بظاہر مختلف نظموں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں لیکن سب کا ایک مرکزی خیال ہے اس لیے تمام نظمیں مل کر طویل نظم بن جاتی ہے۔

ان سب شعراء کے علاوہ اور بھی بہت سے شعراء ہیں جو جدید شاعری کے زیر اثر طویل نظم کو فروغ دے رہے ہیں نظم طباطبائی نے 'گورے غریباں ، اور ساقی نامہ'' لکھا۔ نازش پرتاپ گڑھی کی طویل نظم ''زندگی سے زندگی کی طرف'' میں جدو جہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔روشن صدیقی کی طویل نظم ''کارواں میں'' انھوں نے مسائل حیات پر فلسفانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ساغر نظامی نے '' مسیحانِ اقوام، چاند کا سفر، اور نہرو نامہ'' جیسی طویل نظمیں اردو ادب کو فراہم کی ہیں۔ڈاکٹر عبدالمجید شمس آبادی نے ''حیات وکائنات'' نامی طویل نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھیں۔ حامد اللہ افسر نے ''رزم آخر'' اور ''آدمی نامہ'' جیسی اہم طویل نظمیں لکھیں۔ سید علی مہدی رضوی نے ''مطلوع وطن'' کے نام سے تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔نریش کمار شاد نے ''چاندنی اور اندھیری رات'' کے نام سے منظوم آپ بیتی لکھی ہیں۔

رفعت سروش نے ''نئے قافلے نئی منزلیں '' اور ''جب پھول کھلیں'' جیسی طویل حقیقت پسندانہ نظمیں لکھیں ہیں۔اختر بستوی نے ''نغمہ شب'' اور ''بحر بیکراں'' جیسی کامیاب طویل نظمیں لکھیں ہیں۔شجاع خاور نے ''دوسرا شجر'' اور فہمیدہ ریاض نے ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'' جیلان کامران کی '' استانزے'' اور جعفر طاہر کی ''ٹھٹ'' طویل نظموں میں تجربے اور طرزِ اظہار کی جدت لیے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' شمس الرحمن فاروقی کی ''نامکمل سوانح حیات'' دل کرشن اشک کی ''خراباں'' شہاب جعفری کی '' سورج کا شہر'' کرامت علی کرامت کی ''راستے کی کہانی'' خلیل الرحمن اعظمی کا ''تانڈو ناچ'' عنبر بہرائچی کی ''لم یات نظیرک فی نظیر'' قیصر الجعفری کی ''چراغ حرا'' نصیر پرواز کی ''رسول اکرم'' وغیرہ جیسی طویل نظمیں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

حواشی:

۱۔ تاریخ ادب اردو،رام بابو سکسینہ،مترجم مرزا محمد عسکری ۲۰۰۰ء ص ۳۶۲

۲۔ اردو میں طویل نظم نگاری،ڈاکٹر روشن کاظمی،ص ۲۸

۳۔ جدید اردو ایک مطالعہ،ڈاکٹر قاسم امام،ص ۱۰۹

۴۔ طویل نظم ایک مختصر جائزہ،سلیم شہزاد (سہ روزہ قومی سمینار،بہ عنوان،عصری اردو ادب،ڈاکٹر باموپونی ورسٹی،اورنگ آباد) ص ۱۰

□□□

Scanned with CamScanner

نوطرزِ مرصع: ایک اجمالی تعارف

غلام علی اخضر

R-197/401

ثمرا پارٹمنٹ، جوگا بائی ایکسٹینشن

جامعہ نگر اوکھلائی دہلی

رابطہ: 7575989646

''نوطرز مرصع'' اولین اردو داستانوں میں سے ایک ہے۔ایک زمانے تک اسے شمالی ہند کی پہلی اردو داستان سمجھا جاتا رہا،لیکن بعد میں اولیت کا سہرا کربل کتھا کے سر بندھ گیا۔اسے میر محمد حسین عطا خان نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فارسی زبان کے قصۂ چہار درویش سے اردو زبان میں منتقل کیا۔تحسین نے داستان کو سادہ سلیس زبان نہ دے کر رنگین اور مقفیٰ اسلوب میں بیان کیا جو اس زمانے کا پسندیدہ اسلوب تھا۔اس اسلوب نے داستان کی زبان کو عربی فارسی تراکیب سے گنجور کردیا۔یہی نہیں بلکہ تحسین نے اس میں نثر کے ساتھ ساتھ شعر کا بھی استعمال کیا۔اس طرز اسلوب نے اس داستان کو ایک پرکشش اور گراں قدر فن پارہ بنا دیا۔

مصنف نے اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ دوسرے شعرا کے بھی اشعار کو جا بجا نقل کیا ہے اور بعض جگہوں میں شعر میں کچھ تحریف سے بھی کام لیا ہے۔

میر محمد حسین عطا خاں کا تخلص تحسینؔ ہے اور خطاب ''مرصع رقم خاں'' ہے۔وہ ضلع اٹاوہ کے ایک بااخلاق گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔والد محترم محمد باقر شوق فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش نویسی میں بے مثال اور نستعلیق آمیز شکستہ کے موجد تھے۔تحسین کے اجداد بابر بادشاہ کے دور میں ''گردیز'' (افغانستان) سے ہندوستان آئے اور ''کڑہ مانک پور'' میں مقیم ہوئے۔ پھر تحسین کے والد وہاں سے دہلی آگئے اور ''اورنگ زیب'' نے انھیں سہ ہزاری منصب و جاگیر سے نوازا۔تحسین ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ان کی شاعری زبان کے اعتبار سے نثر سے کہیں زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے۔

نوطرز مرصع کی وجہ تصنیف: ''نوطرز مرصع'' میں قلم بند کی گی داستان چار درویش کی کہانی ہے۔ اس داستان کو تحسین نے ایک سفر کے دوران اپنے کسی ہم سفر کی زبان سے سنا تھا۔قصہ سننے کے بعد تحسین کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اسے کیوں نہ اپنی زبان میں لکھا جائے۔اسی خیال کے پیش نظر یہ معرکۃ الآراء، اردو کی یہ داستان وجود میں آئی۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

"نوطرز مرصع" لکھنے کا خیال، جس کا اصل نام "انشائے نوطرز مرصع" ہے، تحسین کو اس وقت آیا جب وہ جنرل اسمتھ کے ساتھ کشتی کے ذریعے کلکتہ جا رہے تھے۔ تحسین نے اپنے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ سفر طویل تھا۔ اس لیے ایک 'عزیز سراپا تمیز' حکایات عجیب وغریب سے دل بہلاتے تھے۔ ایک دن اس عزیز نے دوران سفر "قصہ چہار درویش" بھی تحسین کو سنایا اور اسے سن کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ 'مضمون اس داستان بہارستان کے تئیں بھی بیچ عبارت رنگین زبان ہندی کے لکھا چاہیے کیوں آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا، اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اور اردوئے معلیٰ کا رکھتا ہو، مطالعہ اس گلدستہ بہاریں کے سے ہوش و شعور فحوائے کلام کا حاصل کرلے"۔

سن تصنیف:

مصنف نے 1768ء میں ہی نوطرز مرصع کو تحریر کرنا شروع کر دیا تھا مگر 1769 میں جنرل اسمتھ کے ہندوستان چھوڑ دینے کے سبب یہ کام رک گیا۔ اس کے بعد کچھ حصہ عظیم آباد کی ملازمت کے دوران لکھا۔ پھر جب فیض آباد آئے تو نواب شجاع الدولہ کے حکم سے اس کام کو انجام تک پہنچایا۔ لیکن اپنی اس کاوش کو وہ شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کرتے، اس سے پہلے نواب صاحب کا انتقال (1775) ہوگیا۔ اب تحسین نے اس میں ایک قصیدہ شامل کر کے نواب آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان 1775ء میں مکمل ہوئی۔

وجہ تسمیہ:

اس داستان کا نام "نوطرز مرصع" رکھنے کی دو وجہ ہو سکتی ہے۔ اول وجہ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے خطاب کی مناسبت سے رکھا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مرصع تحریر رقم کرنے کا نیا طرز اپنانا مقصود ہو، جس پر خود مصنف کو دعویٰ بھی تھا کہ سلف میں کوئی شخص اس ایجاد تازہ کا نہ ہوا۔

قصے کا ماخذ: جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، تحسین نے یہ کہانی ایک ہم سفر کی زبانی سنی تھی جسے بعد میں اپنی زبان میں پیش کیا، اس کہانی کو نوطرز مرصع کی تصنیف سے پہلے فارسی میں دو مؤلفین نے لکھا۔ پہلے مولف کا نام حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم علی ہے جن کی تالیف کو بہت زیادہ شہرت نہیں ملی، دوسرے میر احمد خلف شاہ محمد ہیں۔ ان کی تالیف کو بہت شہرت ملی۔ کچھ محققین نے اس چہار درویش کے قصے کی تصنیف کو حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس بات کی دلیل کہیں سے نہیں ملتی۔

داستان:

"نوطرز مرصع" کی داستان روم کے فرخندہ سیر نام کے ایک بادشاہ سے شروع ہوتی ہے، جس کی حکمرانی میں ہر طرف خوش حالی اور امن امان ہے مگر بادشاہ لاولد ہے۔ عمر کی زیادتی سے ناامید ہو کر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آخر جب میرا کوئی وارث نہیں ہے تو ایسی حکومت کرنے سے کیا فائدہ، اس فیصلے سے امراء ورعایا سب پریشان ہوگئے اور بادشاہ سلامت سے کہا کہ اس طرح ملک کا نظام برباد ہو جائے گا۔ خدا نے تو آپ کو اسی لیے بھیجا ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ دن کو امور سلطنت سنبھا لیے اور رات کو بزرگان دین کی زیارت کیجیے۔ بادشاہ اس بات پر راضی ہوگیا۔ ایک رات محل سے نکل کر باہر آیا تو دیکھتا ہے کہ تیز آندھی میں ایک چراغ جل رہا ہے۔ بادشاہ حیران ہوا اور جب چل کر وہاں دیکھا تو چار درویش بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بادشاہ تمام درویشوں کی باتوں کو سنتا رہا آخر میں تیسرے دویش کی کہانی ختم ہوتے ہی فجر کی آذان ہوگئی، وہاں سے بادشاہ محل میں آیا اور ملازموں سے کہا کہ فلاں جگہ چار دریش ہیں انھیں عزت کے ساتھ دربار میں حاضر کرو۔ وہ درویش حاضر ہوئے اور پھر بادشاہ نے چوتھے درویش کی کہانی سننا چاہی مگر اس سے پہلے خود ایک کہانی (خواجہ سگ پرست کی) سنائی۔ اس کے بعد چوتھے نے سنانا شروع کیا۔ کہانی ختم ہوتے ہیں بچے کی پیدائش کی خبر آئی۔ داستان میں کہانی بادشاہ سے شروع ہو کر ختم بھی بادشاہ ہی پر ہوئی ہے یعنی قصہ میں وحدت قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں داستان نگار کامیاب بھی ہیں۔

اسلوب:

یہ داستان کئی وجوہ سے اردو کی ایک اہم داستان ہے۔ اس کی اہمیت کی ایک وجہ اس کا اسلوب بیان ہے جس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے پہلے خود اسلوب کو سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔

اسلوب کے بارے میں کچھ فیصلہ کن نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اسلوب ہے کیا؟ بس آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ: "اسلوب افکار وخیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا ڈھنگ ہے جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی ہو "یا یوں کہیں کہ: "اسلوب لسانی خصوصیات میں انفرادیت بخشنے کا ذریعہ ہے جس سے ہم کہہ سکتے

Scanned with CamScanner

ہیں کہ یہ فلاں مصنف کی تصنیف یا تخلیق ہے'' اس لیے کہ زبان کی بنیادی شکل اگر چہ ایک جیسی ہوتی ہے، مگر اس کے استعمال کرنے کا طرز ہر ادیب کے یہاں جداگانہ ہوتا ہے۔ جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلوب میں الفاظ کی ترتیب اور اس کے انتخاب کا سلیقہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اچھے خیال کو کسی دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنے کے لیے اچھے الفاظ بھی ضروری ہیں۔ اسلوب فن پارے کے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہے ہم اس کا اندازہ فلابیر کے اس نظریے سے کر سکتے ہیں: ''طرز اسلوب خیال کا لباس ہی نہیں، اس کی کھال ہے'' اور الگزنڈر اسمتھ نے یہ کہا کہ: ''خیال سے زیادہ پائیدار اور لازوال شے، ادب میں اسلوب ہے۔

تحسین نے ایسے ماحول میں اس داستان کو لکھا، جب سلیس اور سادہ تحریر کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اہل زبان اسی تحریر کو زیادہ پسند کرتے تھے جس میں عبارت رنگین، مرصع اور مقفی ہو۔ اس رجحان نے تحسین کی تحریر میں عربی الفاظ، فارسی تراکیب اور ان زبانوں کے مزاج کے ساتھ ساتھ ان کی روایت کی گہری چھاپ چھوڑی۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے:

''جب طائر زرین بال آفتاب کے نے رخ بیچ آشیانہ مغرب کے کیا اور بیضۂ سیمین ماہتاب کا بطن مرغ مشکین شب تار کے سے نمودار ہوا مستحفظان ومحارسان شہر کے نے کہ بموجب حکم والی اس دیار کے مامور تھے، دروازہ شہر پناہ کا مسدود کر کے راہ آمدو رفت صادر و وارد کی بند کی۔ ہر چند کہ عاجز نے ساتھ کمال لجاجت وسماجت کے زبان عجز و نیاز کی واسطے در آمد ہونے شہر کے کھول اصلاعرض میری کے تئیں پیرایہ اجابت کا نہ بخشا۔ لاچار بیچ پناہ دیوار کے استقامت کر کے مزاج کے تئیں واسطے شغل بیداری و شب گزاری کے اوپر تماشا برج حصار کے کہ رفعت عمارت اس کی ہمسر چرخ بریں کی تھی، مصروف کیا۔ جس وقت زلف خاتونِ شب کی کمر تک پہنچی اور چشم خلائق کی خمار نشۂ غنودگی کے سے سرمست خوابِ غفلت کے ہوئی، یکا یک صندوقِ چوبین فرازِ دیوار حصار کے سے مانند خورشید کے برج حمل کے سے جلا بخش دیدۂ تماشابیں ہوا''۔

تحسین نے داستان کے طرز نگارش میں خوب تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بیان پر کس قدر قدرت ومہارت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے تحسین ایک کامیاب اور اعلیٰ داستان گو نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر منظر کی عکاسی کے لیے الگ الگ لفظوں کا انتخاب ہوتا ہے، جس سے اندازِ پیش کش میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دیکھیے صبح کی آمد پر اندازِ بیاں:

''الٰہی کب مرغ صبح خیز شمس کا بیچ قفس مشرق کے منقار شعاع کے سے صدا روشنی کی بلند کرے گا اور کب عابد شب زندہ دار ماہ کا تسبیح ستاروں کے تئیں بیچ سجادۂ سپہر کے رکھ کے متوجہ آرام گاہ مغرب کے ہوگا کہ میں داخل شہر کے ہو کر تدبیر معالجہ کی کروں۔ اس عرصہ میں شاہ زرین کاہ خورشید کا اوپر تخت زمردین افلاک کے جلوہ آرا ہو کے تجلی بخش ساحت سرزمین دمشق کا ہوا''

''جس وقت مغبچہ مخمور خورشید کا خم خانہ مشرق کے سے گلابی صبح کی ہاتھ میں لے کر واسطے شکست خمار کے طرف ساغر گل کے کہ شراب صبوحی شبنم کی سے پر تھا متوجہ ہو''

شام کی منظر کشی داستان گو کی زبان سے کس طرح ہوتی ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں:

''عروس شفق کی نے کاکل مشکیں شام کی اوپر چہرے کے کھینچی''

''جس وقت زاہد سومعہ دار روز کا، قرص آفتاب کے تئیں بیچ حلق شفق کے فرو لے گیا''

مصنف کو عربی و فارسی زبانوں پر دسترس حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں ہندی زبان پر بھی کمال حاصل تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہم بخوبی کر سکتے ہیں:

☆ مجھے تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ ایک
کاونت اس بدھاوا گانے آیا تھا۔

☆ اس ہرن نے جو من ہرا میرا
دل کے رَمنے کا یہ شکاری ہے

☆ رورو پتیاں میں لکھی، جی کا گد لپٹائے

☆ ہے کا سدا ایسا کوئی پیتم کو لے جائے

مصنف نے طرز نگارش میں جمع الجمع سے بھی خوب موتی پیروئے ہیں:

''توجہات بے غایات، برآرندۂ حاجات بستہ کاراں، بخشندۂ مرادات امیدواراں، امورات، مستحفظان، محارسان، نظارات، اکابران، کار پردازان، غلاماں غلمان، سجدات، نبایات، رنجوران، بیماران، عذاران جیسے الفاظ شامل ہیں''

''نو طرز مرصع'' کا اسلوب ہمیں اگر چہ پر تصنع اور پر تکلف معلوم ہوتا ہے مگر یہ انداز ان کی مجبوری تھی، کیوں کہ وہ اہل زبان کے نزدیک ایک ایسا اولین اسلوب رکھنا چاہتے تھے جو

Scanned with CamScanner

آئندہ نثر نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔

نوطرز مرصع کے اسلوب میں اول تا آخر یکسانیت نہیں، کیوں کہ جو ابتدا میں عبارت کی رنگینی نظر آتی ہے آخر میں جاتے جاتے پھیکی پڑنے لگتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ مصنف زبانوں کی بناوٹ سے اکتا گئے ہوں۔ اس بچ کو ذیل کے اقباس سے سمجھ سکتے ہیں:

> ''ایک روز اتفاقاً موسم بہار میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا اور ابر بھی زور طرح سے ہو رہا تھا اور بجلی بھی یوں کوندر ہی تھی جس طرح بینجنی پوشاک پر کناری چمکتی ہے اور ہوا بھی خوب ہی موافق پڑی تھی اور چھوٹی چھوٹی بوندیوں کے ترشح نے عجب مزا کر رکھا تھا اور ستھری ستھری گلابیاں شرابِ ارغوانی سے بھری ہوئیں اس ڈول سے رکھیاں تھیں کہ یاقت کا جگر اس کی جھلک کی حسرت سے خون ہوجاوے۔ چاہتی ہوں کہ ایک جام اس بادۂ مرووق سے نوش کروں''

اس داستان میں ہمیں اس عہد کے محلات کی آرائش، مغلوں کا شوق، اور باغات میں آرائش وزیبائش کے سامان بھی ملتے ہیں۔ ذیل میں تحسین کی زبانی اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ترشح سے تقاطر کے باغ کے درختوں پر یہ عالم ہو رہا تھا کہ گویا چتر زمرّدیں پر موتیوں کی جھالر جھلکی ہے اور سرخی گل ہائے شقائق و ریاحین کی شام کے وقت بدلی میں لطف دیتی تھی کہ جیسے رنگریز قدرت ابر کے وصلیے شفق میں پھیلا رکھتا ہے۔ بوٹا کاری و رنگ طرازی، نقش و نگار بنگلوں کی نے نگار خانہ ارزنگ کے تئیں پرے کر رکھا تھا اور شفافی آب زلال حوضوں کی نے صفائے تختہ آئینہ حلبی کے تئیں بے آب کریا''

مصنف نے جب اپنے داستان میں دعوت کا ذکر کیا ہے تو اس زمانے کے تمام رائج شدہ کھانے کا ذکر مرصع انداز میں کر دیا؛ جس سے ہمیں اہتمام طعام کے ساتھ شاہی دسترخوان کا بھی علم ہوتا ہے۔

> ''جب طائر زرین بال آفتاب کے نے رخ بیچ آشیانہ مغرب کے کیا اور بیضۂ سیمین ماہتاب کا بطن مرغ مشکین شب تار کے سے نمودار ہوا مستحفظان و محارسان شہر کے نے کہ بموجب حکم والی اس دیار کے مامور تھے، دروازہ شہر پناہ کا مسدود کر کے راہ آمد و رفت صادر و وارد کی بند کی۔ ہر چند کہ عاجز نے ساتھ کمال لجاجت و سماجت کے زبان عجز و نیاز کی واسطے درآمد ہونے شہر کے کھول اصلاعرض میری کے تئیں پیرایہ اجابت کا نہ بخشا۔ لاچار بیچ پناہ دیوار کے استقامت کر کے مزاج کے تئیں واسطے شغل بیداری و شب گزاری کے اوپر تماشا برجِ حصار کے کہ رفعت عمارت اس کی ہمسر چرخ بریں کی تھی ، مصروف کیا۔ جس وقت زلف خاتونِ شب کی کمر تک پہنچی اور چشم خلائق کی خمارنشہ غنودگی کے سے سرمست خوابِ غفلت کے ہوئی ، یکا یک صندوقِ چوبین فرازِ دیوار حصار کے سے مانند خورشید کے برج حمل کے سے جلا بخش دیدۂ تماشا بیں ہوا''۔

اس عزیز نے کمال تکلف سے سامان ضیافت کا مہیا کر کے سفرہ دعوت کا آراستہ کیا اور انواع طعام ہائے لذیذ وخوشگوار و اقسام شیرینی ہائے حلاوت بخش و چاشنی دار د اصناف شربت ہائے گلاب و بید مشک و گونا گوں میوہ ہائے تر وخشک وغیرہ ولوازمہ اکل وشرب از قسم نان یزدی و نان ورقی ونان تنگی ونان پنیری ونان خمیری ونان باقر خانی وگاؤ زبان وگاؤ دیدہ آبی وروغنی وخطائی وشیر مال ونان گلدار، قلیہ دو پیازہ، نرگسی وشیرازی وزعفرانی و بادامی، کباب، قلیہ، کوفتہ، خاگینہ، ملغوبہ، پن بھتہ، بورانی، بریانی، نور محلی وخراسانی، رومی، تبریزی، وشب دیگ، دم پخت، خشکہ و مزعفر وشولا وتنجن پلاؤ وقورمہ پلاؤ ویخنی پلاؤ وحبشی پلاؤ وبیگمی، چاشنی، عنبری، کاشاشنی وماہی کباب ومرغ کباب وسیخ کباب وبیضہ کباب وحلیم وحریسہ وسموسہ وقبولی وطاہری و کھچڑی وفرنی وملائی وحلوا وفالودہ ونمش، قندی بامشک نافہ وساقِ عروس ولوزیات، اچار، مربے ، ناشپاتی ، بہی، انگور، انجیر سیب ، انار، کشمش، بادام، چھوہارے، پستے وغیرہ''

شاید مصنف نے کچھ زیادہ ہی غلو سے کام لیا ہے۔ ان سے جتنے بھی نام صفحۂ قرطاس ہو سکتے تھے، قلم زد کر دیئے۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ذکر شدہ تمام کھانے رائج وقت تھے یا نہیں۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ کھانے سے نوابوں کی دل چسپی کا پتا چلتا ہے۔

بہر حال، یہ بات تو طے ہے کہ تحسین نے اپنی اس داستان کے ذریعے شمالی ہند میں اردو کو ایک منفرد اسلوب عطا کیا اور بعد کے قلم کاروں کے لیے ایک سمت متعین کی، تحسین کا یہ کارنامہ اردو ادب کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔ یہ اپنی کہانی، طرز بیان اور اسلوب کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

□□□

Scanned with CamScanner

ابراہیم گلستاں کی زندگی اور کارنامے پر ایک نظر

سید اختر حسین رضوی

ریسرچ اسکالر

شعبۂ فارسی

لکھنؤ یونیورسٹی

رابطہ: 9621634505

ابراہیم گلستاں ایک ادیب، افسانہ نگار، مصور، مترجم، فلم ساز اور فلم ڈائرکٹر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔گلستاں ۲۶ مہر ۱۳۰۱ شمسی ر ۱۹۲۳ء میں شیراز میں پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد کا نام محمد تقی ہے۔وہ شیراز کے مشہور اخبار گلستاں کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔آذر ماہ، آخر پائیز اور مدومہ وغیرہ نو افسانوں کی شکل میں ان کی ادبی کاوشیں قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اسی طرح ان کے چار ترجمے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں، جن میں مشہور انگریزی ادیب آرنیسٹ ہمیکوی کی تخلیقات کا ترجمہ بھی شامل ہے۔اسی طرح سات عدد دستاویزی اور چار فلمی کہانیاں بھی ان کی تخلیقات کی فہرست میں شامل ہیں۔بہمن فرمان آرا نے ''یک بوس کو چلو'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔جس میں ابراہیم گلستاں کی زندگی سے متعلق کچھ اشارے اور حوالے دئے ہیں۔ گلستاں نے وینس میں فلمی فیسٹیول کے موقع پر اپنی فلم ''یک آتش'' برنز میڈل بھی جیتا تھا۔ابراہیم تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔انہوں نے گھر پر ہی ایک ذاتی لائبریری بنا رکھی تھی۔ایسے ماحول میں انہوں کم سن ہی میں جب چوتھے یا پانچویں درجے میں زیر تعلیم تھے، عربی اور فرانسیسی زبانیں سیکھ لیں۔

۱۵۔۱۳۱۴ر۲۷۔۱۹۲۶ میں صادق ہدایت کی تخلیقات سے آشائی کے دوران خصوصیت سے ''سے قطرۂ خون'' اور ''انیران'' کا مطالعہ کیا، اس کے علاوہ انہوں نے پدرگلی ترقی کی تخلیق ''خانم ہندی'' مطبوعہ ۱۳۰۸ر۱۹۳۹ء اور حاجی بابائے اصفہانی مطبوعہ استنبول، بوسہ عذرا کی تخلیقات ''کنت منت'' کریستو، سہ تفنگدار، بیست سال بعد، وینکت ڈبراژلون، لارن مارگو وغیرہ کتابوں کا اس وقت مطالعہ کیا جب چھٹے درجے میں زیر تعلیم تھے۔ان کتابوں کے مطالعہ کے لئے اپنے والد کی ذاتی لائبریری کے علاوہ شاپور انٹرمیڈیٹ اسکول کی لائبری کی بھی خاک چھانی اور کبھی مختلف لائبریریوں سے کرائے پر کتابیں لے کر مطالعہ کرتے تھے۔جب وہ آٹھویں درجے کے طالب علم تھے تو ژول ورن کی تخلیق ''ہشتاد روز دور دنیا'' (دنیا کے گرد ۸۰ دن) کا ترجمہ کیا۔

ابراہیم گلستاں کی میدان سیاست میں گام فرسائی:

۱۳۲۰/۱۹۴۲ میں ابراہیم نے تہران یونیورسٹی کے لا فکلٹی میں داخلہ لیا مگر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر انہوں نے میدان سیاست میں قدم رکھ دیا اور تودہ پارٹی (عوامی لیگ) کے ممبر بن گئے ۔ ۱۳۲۲/۱۹۴۴ میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد اپنے والد ماجد کے دوست ڈاکٹر مصدق سے ان کا تعارف اس وقت ہوا جب سید ضیاء الدین اور ڈاکٹر مصدق کا باہمی نزاع نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

سید ضیاء الدین گلستاں کی خوش دامن کے باپ کے چچا زاد بھائی تھے ۔ڈاکٹر مصدق کی اجازت سے گلستاں نے تیل کی قومی صنعت اور ابادان پر فلم بنایا۔

گلستاں تودہ پارٹی کے ترجمان اخبار ''رہبر'' اور اس سے پہلے اخبار ''ارگان'' اور ''حزب'' کے کالم نویس رہے ۔تا آنکہ اس کے ایڈیٹران چیف بن گئے اور وہاں سے مازندران چلے آئے۔ یہاں مشرقی مازندران کے تودہ پارٹی کے ذمہ دار بنائے گئے ۔ اپنے مخصوص افکار وخیالات کی وجہ سے پارٹی کی سرگرمیوں اور کارکردگی میں پارٹی کے سربرآوردہ حضرات سے اختلاف کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس سے الگ ہو گئے۔

صحافت اور سنیما سے ابراہیم کی دلچسپی:

ابراہیم گلستاں کو سنیما سے بڑی دلچسپی تھی ۔جب وہ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول تھے تب بھی ہر رات سنیما جانے کی کوشش کرتے تھے ، اس کے بعد وہ ساری سے ابادان گئے اور مازندران کی شکست کے بعد وہاں کے حالات پر ایک نہایت دلکش کہانی لکھی جوان کی تخلیق ''آذر ماہ آخر پائیز'' میں چھپ کر منظر عام پر آئی ۔انہی دنوں انہوں نے بین الاقوامی ٹیلی ویژن چینل اور نیوز ایجنسیوں کے لئے رپورٹنگ ، فوٹوگرافی اور فلم سازی کرنی شروع کی۔

ابراہیم گلستاں کی افسانہ نگاری اور ترجمہ سے دلچسپی:

ابراہیم گلستاں ابتداء میں اپنے والد کے اخبار کے لئے مقالے لکھا کرتے تھے ۔ ۱۳۲۳/۱۹۴۵ ء میں تہران میں مقالہ نگاری اور ترجمہ کا کام شروع کیا۔ مارکسزم پر دو بنیادی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔جس میں ایک تو اسٹالن کی کتاب ''دیالکتک'' ہے ۔ دوسری مارکس کی کتاب ''اصول مارکسزم'' ہے ۔ ۱۳۲۶/۱۹۴۸ میں اپنی پہلی کہانی ''بہ دزدی رفتہ ہا'' تھا۔ کے عنوان سے لکھی اور اسی سال ماہنامہ مردم میں اسے شائع کیا۔ بعد میں ۱۳۲۸/۱۹۵۰ میں اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ ''آذر ماہ آخر پائیز'' کے عنوان سے شائع کیا۔اس کے بعد ہمینگوئی ، فاکنز اور چخوف کے افسانوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان افسانوں کے مجموعہ کو ''کشتی شکستہ ہا'' کے عنوان سے شائع کیا۔اس دوران وہ کئی سیاسی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہے۔

۱۳۲۶/۱۳۵۸ میں اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''شکار سایہ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد ڈاکومنٹری فلم سازی میں مشغول ہو گئے اور اپنی ساری توجہ گلستاں نامی اسٹوڈیو پر مرکوز کردی۔

گلستاں کی فروغ فرخزاد سے آشنائی:

ابراہیم گلستاں کی فروغ سے آشنائی کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ سہراب دوستدار اور رحمت الٰہی فروغ کو ان کی کتاب کی ٹائپنگ کی غرض سے ''اسٹوڈیو گلستاں'' لے گئے ۔اس وقت تک فروغ کے تین مجموعہ ہائے کلام ''عصیاں ، دیوار، اسیر'' شائع ہو چکے تھے ۔گلستاں اور فروغ کے معاشقہ کی داستان ہنوز د مشہور اور نامور فنکاروں کے درمیان دلکش داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابراہیم گلستاں ۱۳۳۰/۱۹۵۲ کی دہائی میں فروغ کے دام محبت میں گرفتار ہوئے۔فروغ ایک جوان سال شاعرہ تھیں ، اپنے سے تیرہ سال بڑے گلستاں کو پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھیں ۔گلستاں نے اکیس سال کی عمر میں اپنی چچازاد بہن فخری گلستاں سے شادی کی تھی اور اس سے دو بچے کاوہ گلستاں اور لیلیٰ گلستاں پیدا ہوئیں ۔گلستاں سے آشنائی کے وقت فروغ چوبیس سالہ مطلقہ عورت تھی اور گلستاں ۳۷ سالہ تجربہ کار اور مشہور ادیب تھا۔ فروغ ایک باصلاحیت شاعرہ تھیں جس نے خصوصیت سے اپنے مجموعہ کلام ''عصیان'' کے ذریعہ لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ۳۸ـ۱۳۳۷/۶۰ـ۱۹۵۹ میں دونوں فنکاروں کی آشنائی اور دوستی دونوں کے حق میں نہایت بارآور ثابت ہوئی جبکہ فخری اور اس کے دونوں بچوں کے لئے رنج والم کا پیغام لے کر آئی۔

۱۳۴۱/۱۹۶۳ میں فروغ نے گلستاں کے تعاون سے ''این خانہ سیاہ است'' کے عنوان سے ایک دستاویزی فلم بنائی جو تبریز کے جذام خانہ کے بابت تھی ۔یہ فلم کن (Cannes)

کے فلمی جشن میں شمولیت کے لئے پیش کیا۔لیکن اس کے اندر چونکہ بڑے دردناک مناظر کی تصویر کشی کی گئی تھی، جن سے عوام کو محروم رکھا جاتا اور اس کی نمائش صرف جیوری بورڈ یعنی فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے سامنے کی جاسکتی ہے۔ ان کی رائے سن کر گلستاں نے اس کی نمائش روک دی۔لیکن اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ فلم تو انسان ہی کی خاطر بنی ہے۔اس کا موضوع ہی انسان اور انسانیت ہے ، وہ لوگ نہیں ہیں جو زرق برق لباس پہن کر اس کا تماشا دیکھیں۔

غرض کہ گلستاں ''موج و مرجان و خارا'' کے عنوان سے ایک دستاویزی فلم کے ڈائرکٹر بن گئے ۔انہوں نے فروغ کے مجموعہ کلام ''تولدی دیگر'' کو جس کی تعریف کرتے تھکتے نہیں تھے، زیور طبع سے آراستہ کر کے شائع کیا، جس میں گلستاں پر فروغ کی والہانہ فریفتگی کی چھاپ نظر آتی ہے۔گلستاں نے اپنے گھر کے پاس ہی فروغ کے لئے ایک ویلا فراہم کیا جہاں مطالعہ کتب کی سہولت بھی حاصل تھی ۔یہاں سے وہ دونوں ایک ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔دستاویزی فلم 'موج و مرجان و خارا'، ''خشت و آئینہ'' ان دونوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہیں ۔۱۳۴۵/۱۹۶۷ میں ۳۲ سال کی عمر میں فروغ کا انتقال ہوگیا۔اس کی وجہ سے دونوں کی مشترکہ تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ گلستاں پر اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ زبردست افسردگی کا شکار ہوگیا اور اپنے خاندان سے کنارہ کش ہوگیا۔۱۳۵۹/۱۹۷۲ کی دہائی میں گلستاں نے فارسی زبان و ادب کے میدان میں کوئی قابل قدر کام نہیں کیا سوائے ایک فلم بہ عنوان ''اسرار گنج درہ جنی'' کے، جس کا اہم فلموں کی فہرست میں شمار نہیں ہوتا ہے ۔۱۳۵۷/۱۹۷۹ میں گلستاں انگلینڈ روانہ ہوگیا اور اپنے خاندان سے کنارہ کش ہو کر وہاں زندگی گزارنے لگا۔۱۳۸۹/۲۰۱۱ میں ''ریڈیو دویچہ ولہ'' میں گلستاں کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں ایرانیوں کی اس عادت کا تذکرہ کیا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی تعریف کرتے ہیں جو درحقیقت فروغ کے بابت ایرانی نقاد رضا براہنی کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی پر طعن ہے۔

اس کا ایک نمونہ مجلہ ''فردوسی'' میں شائع ہوا ہے۔جناب رضا براہنی نے اس مقصد سے کہ کسی دانشور کو خوش کر کے ان کو اپنا معاون بنائیں اور اپنے کو واحد نقاد کی حیثیت سے معاشرے میں متعارف کرائیں، فروغ کے بابت فحش گوئی سے کام لیا اور مجلہ فردوسی کے کئی شماروں میں اس کا تذکرہ کیا۔تازہ ترین تنقید فروغ کی وفات سے دو دن قبل شائع ہوئی تھی۔ یہ مقالہ سب و شتم سے بھرا ہوا جمعرات کے شمارے میں شائع ہوا اور فروغ کا انتقال دوشنبہ کو ہوا۔اگلی جمعرات کے شمارے میں انہیں براہنی کا مقالہ شائع ہوا جس میں فروغی کی تعریف وتوصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملادئے ۔انٹرویو لینے والا پوچھتا ہے کہ کیا آپ کا اشارہ رضا براہنی کی طرف ہے؟ گلستاں جواب دیتے ہیں مجھے پتہ نہیں میں ان کا نام بھول رہا ہوں۔

(رابطہ عاشقانہ ابراہیم گلستاں وفروغ فرخ زاد در یک نگاہ، پایگاہ خبری تحلیلی تیتر ہنر ۱۳۹۵)

دستاویزی فلم سازی میں ابراہیم کی دلچسپی:

۱۳۴۶/۱۹۶۸ میں فلم ''جوئے و دیوار وتشنہ'' اور ۱۳۴۸/۱۹۷۰ میں فلم ''مدومہ'' شائع کیا۔اس دوران ابراہیم نے مارک ٹواین کی تخلیق ''ہاکلبری فین''، برنارڈ شا کی تخلیق ''دون ژوان درجہنم'' اور شیکسپیئر کی تخلیق ''مکبث'' کا ترجمہ کیا۔مکبث کا ترجمہ شائع نہیں ہوسکا اس نے اپنی زیادہ تر توانائی دستاویزی فلم سازی پر صرف کی۔

۱۳۲۸/۱۹۵۰ کے انقلاب کے بعد گلستاں نے ایرانی تیل کے تیسرے کنسر میں تعاون کیا۔اس کنسر نے تصویروں اور خبروں کی فراہمی کے لئے ایک سرکل تیار کیا جس میں گلستاں قرارداد کے فرد قرار پائے۔گلستاں کی پہلی دستاویزی فلم ''از قطرہ تا دریا'' اسی دور کی ادبی کاوش ہے۔ان کی بیشتر دستاویزی فلمیں نمایاں اور قابل تعریف ہیں۔

۱۳۴۴/۱۹۶۶ میں گلستاں نے ''خشت و آئینہ'' نام کی اولین افسانوی فلم تیار کی ۔خشت و آئینہ کے بعد ۱۳۴۵/۱۹۶۷ میں مرکزی بینک کی فرمائش پر دستاویزی فلم ''گنجینہ ہائے گوہر'' تیار کی۔۱۳۵۰/۱۹۷۲ میں ''اسرار گنج درہ جنی'' کے عنوان سے ایک فلم بنائی جس کا شمار ان کی آخری فلموں میں ہوتا ہے ۔ دستاویزی فلم ''گنجینہ ہائے گوہر'' بنانے کے بعد جس میں شاہی ہیرے جواہرات کا ذکر تھا ''گلستاں اسٹوڈیو'' پر قدغن لگ گئی ۔۱۳۵۰/۱۹۷۲ سے پہلے بھی گلستاں نے چند دستاویزی فلمیں بنائی تھیں جن کا تذکرہ چنداں ضروری نہیں۔

اسرار گنج درہ جنی'' پر بھی کچھ دنوں کے بعد سنسر بورڈ نے روک لگادی ۔اس کے بعد گلستاں نے سنیما کے کام سے کنارہ کشی کر لی اور ہمیشہ کے لئے انگلینڈ روانہ ہوگیا۔ بیرون

Scanned with CamScanner

ملک میں قیام کے دوران اس نے گفتہ ہا'' اور ''خروس'' کے نام سے دو کتابیں شائع کیں ۔خروس ایک طویل افسانہ ہے، جسے گلستاں نے ۱۳۴۰/ ۱۹۶۲ کی دہائی کے اواخر میں لکھا اور اس کا پورا متن پہلی بار ۱۳۷۴/ ۱۹۹۶ میں لندن میں شائع ہوا۔''شگوفائی داستان کوتاہ'' نام کی کتاب انقلاب اسلامی ایران کے بعد پہلی دہائی میں سنسر بورڈ کے حذف وترمیم کے ساتھ شائع ہوئی جس نے گلستاں کو آگ بگولہ کردیا۔

گلستاں کی شادی اور اولاد:

گلستاں نے اپنی چچازاد بہن فخری سے شادی کی تھی اور اس سے دو بچے ہوئے ۔ان کی اہلیہ ہنوز ایران میں بقید حیات ہیں اور ان کے دو بچے کاوا اور لیلیٰ بھی ان کے ہمراہ ہیں۔

ابراہیم گلستاں کی زندگی کے مختلف ادوار:

(الف) ۱۳۲۰-۱۳۳۰/ ۱۹۴۲-۱۹۵۲ کی دہائی میں ابراہیم قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تہران آئے یہاں اکیس سال کی عمر میں ۱۹۴۲ میں اپنی چچازاد بہن فخری گلستاں سے شادی کی۔

(گفتگوئے امید فیروز بخش با لیلیٰ گلستاں نثر ثالث)

اس کے بعد تو وہ پارٹی کے ممبر بن گئے اور تہران یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر سیاست داں ہو گئے ۔اس زمانے میں وہ اخبار ''رہبر اور ''مردم'' کے فوٹو گرافر کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۔(داستان شیریں کشف اتم وکاربرد مرگ بار بمب اتم) مقالہ از گلستاں در سال ۱۳۲۵)

۱۹۴۸ میں ''بہ وزدی رفتہ ہا'' کے نام سے اپنے افسانوں کا مجموعہ، جو ان کی پہلی کتاب بھی ہے، شائع کیا۔۱۹۵۸ کے بعد اسٹوڈیو گلستاں کے نام سے اپنے سینمائی اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی ۔اور ایک تیل کمپنی کی تنظیم کی خاطر دستاویزی فلمیں بنائیں ۔مجملہ اس کے ''یک آتش'' و ''موج ومرجان وخارا'' ہے۔(کتاب ہفتہ وبلاگ گروہی اشکبوس)

تیل کمپنیوں سے اسی تعاون کی وجہ سے

> اسرار گنج درہ جنی'' پر بھی کچھ دنوں کے بعد سنسر بورڈ نے روک لگادی ۔اس کے بعد گلستاں نے سینما کے کام سے کنارہ کشی کر لی اور ہمیشہ کے لئے انگلینڈ روانہ ہوگیا۔ بیرون ملک میں قیام کے دوران اس نے گفتہ ہا'' اور ''خروس'' کے نام سے دو کتابیں شائع کیں۔
>
> خروس ایک طویل افسانہ ہے، جسے گلستاں نے ۱۳۴۰/ ۱۹۶۲ کی دہائی کے اواخر میں لکھا اور اس کا پورا متن پہلی بار ۱۳۷۴/ ۱۹۹۶ میں لندن میں شائع ہوا۔ ''شگوفائی داستان کوتاہ'' نام کی کتاب انقلاب اسلامی ایران کے بعد پہلی دہائی میں سنسر بورڈ کے حذف وترمیم کے ساتھ شائع ہوئی جس نے گلستاں کو آگ بگولہ کردیا۔

اس دور کے کچھ روشن خیال حضرات نے اسے ''گلستان نفتی'' کا لقب دیا تھا۔(اکبری وبگاہ سورہ)

ان تخلیقات کے بابت جن پر لوگوں نے واضح موقف اختیار کیا تھا اور گلستاں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا ان میں ایک جلال آل احمد بھی تھے ۔انہوں نے ''موج ومرجان وخارا'' جیسی اشتہاری فلم سازی کو پست ذہن روشن خیال حضرات کی رفتار کا ایک نمونہ قرار دیا۔(دو برادر خاطرات محمد حسین دانائی، انتشارات اطلاعات، چاپ دوم، تہران ۱۳۹۳، ص ۲۸۹)

گلستاں ''خشت وآئینہ اور ''اسرار جنگ درہ جنی نام کے دو افسانوی فلموں کے ڈائرکٹر بھی رہے ۔اسی طرح فروغ فرخ زاد کی ڈائرکٹر شپ میں ''خانہ سیہ است'' نام کی فلم بھی انہی کی بنائی ہوئی ہے ۔فروغ سے گلستاں کا معاشقانہ تعلق تھا۔(رزنیام)

۱۹۶۸ تک اس نے اپنا کوئی مجموعہ افسانہ شائع نہیں کیا۔(کتاب ہفتہ وبلاگ گروہی اشکبوس)

(ب)

انقلاب اسلامی کے بعد گلستاں:

گلستاں ۱۹۷۹ سے انگلینڈ کے صوبہ سا سکس میں زندگی گزار رہے ہیں ۔کاوہ اور لیلیٰ نام کے ان کے دو بچے تھے ۔کاوہ گلستاں ایرانی خبر نگار اور فوٹو گرافر تھے جو ۲۰۰۳ میں بی بی سی ریڈیو کی ٹیم میں شامل ہو کر عراق میں ایک دھماکہ کے زیر اثر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔لیلیٰ گلستاں، ''گلستاں گیلری'' کے مترجم ادیب اور ایڈیٹر ہو کر ایران میں برسرکار ہیں ۔(سائٹ بی بی سی فارسی)

نتیجہ گیری:

درج بالا مفصل بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ابراہیم گلستاں ایک عظیم ایرانی فنکار تھے ۔جو خصوصیت سے افسانہ نگاری، فلم سازی اور مختلف سیاسی مسائل پر اپنے مقالہ نگاری کے لئے مشہور ہیں ۔اس لئے ان پر تحقیقی مقالہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

□□□

Scanned with CamScanner

قطعات

رہرو ہے تو مت بیٹھ جہاں چھاؤں گھنی دیکھ
دانا ہے تو پھر سینے میں لہجے کی انی دیکھ
ہر آئینہ ظاہر و باطن پہ نظر ڈال
بینا ہے تو قطرے میں بھی سد موج زنی دیکھ

....

وقت کی تند ہواؤں میں سنبھلنا ہوگا
جادہ جادہ رہِ دشوار بدلنا ہوگا
منزلیں دور سہی فاصلے بے نام سہی
زندگی شرطِ سفر ہے، ہمیں چلنا ہوگا

....

بہت قریب سے دیکھا ہے اسکو میں نے بھی
نہ کوئی بات نئی ہے نہ کوئی ریت نئی
ہزار کہئے اسے مجرمِ وفا لیکن
نہ اپنی ہار نئی ہے نہ اس کی جیت نئی

....

بہت اداس، اکیلی، سسکتی رات، سکوت
فلک پہ چاند بھی ہے پھر بھی روشنی کم ہے
یقینِ صبح سے دل بدگماں نہیں لیکن
"ستم کی عمر زیادہ ہے زندگی کم ہے"

انس مسرورؔ انصاری
سکراول، اردو بازار، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر
موبائل: 9453347784

قطعات

کوئی تدبیر کیجئے ورنہ
دکھ کی تاثیر دل کو توڑے گی
نیت لمس کی یہ ناپاکی
شہد کو نیم کرکے چھوڑے گی

....

ہے وہی آب و ہوا تو سوچئے
کیوں مقامِ فکر پر سب آ گئے
ایسے ہاتھوں میں ہے گلشن کا نظام
موسم گل میں بھی ہم مرجھا گئے

....

اپنے بچوں کی جان سے بڑھ کر
پرورش سے نہ آپ ہوں غافل
رائے تو یہ ہے کہ خوبصورت سی
پرورش میں ہو تربیت شامل

....

دل ہی میرا ذرا سی مہلت سے
کیا کہوں کیسے اوب جاتا ہے
اس سے پہلے کہ میں تمہیں سوچوں
یہ نئے غم میں ڈوب جاتا ہے

مصداق اعظمی
موضع جوما، پوسٹ مجوا، پھولپور، اعظم گڑھ
موبائل: 8756061160

Scanned with CamScanner

غزل

خجل ہو کر کہاں ہم تم جھمیلا چھوڑ دیتے ہیں
نہ یہ دُنیا نہ رُسوائی کا میلا چھوڑ دیتے ہیں

عداوت کا اندھیرا ہو تو ایسے میں خرد والے
کہیں فہم و فراست کا اُجالا چھوڑ دیتے ہیں؟

تسلّی سے نہیں رکتا کبھی جذبات کا دریا
جگر والے نہ یوں اشکوں کا ریلا چھوڑ دیتے ہیں

عقیدت ہے کہ اپنا تجربہ خانہ بدوشی کا
صفائی میں بھی ہم مکڑی کا جالا چھوڑ دیتے ہیں

مٹا کر خود کو، قوموں کی جو کرتا ہے نگہبانی
اسی کو قافلے والے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں

زمیں پر سانس لینا بھی ہوا جاتا ہے کیوں دوبھر
اُدھر ہم چاند پر شوشہ نرالا چھوڑ دیتے ہیں

کبوتر ہیں بڑے چنچل اثرؔ، خطرے کی آہٹ پر
منارہ ترک کرتے ہیں شوالا چھوڑ دیتے ہیں

مرغوب اثر فاطمی
روڈ نمبر ۷، محلہ علی گنج، گیا (بہار)
موبائل: 9431448749

غزل

فہم و ادراک کی سرحد سے بھی باہر نکلا
پیکر موم جسے سمجھا تھا وہ پتھر نکلا

لمحہ لمحہ یہ اترتا ہی رہا روز و شب
کب مرے دل سے تری یاد کا خنجر نکلا

دربدر لے کے پھری جس کی تمنا مجھ کو
وہ تو پیوست مرے دل کے ہی اندر نکلا

حیف ہے کہ مری پہچان مٹانے کے لئے
مرا بھائی بھی حریفوں کے برابر نکلا

میری آہوں کا اثر اس پہ ذرا بھی نہ ہوا
وہ ستم گار، ستم پیشہ، ستمگر نکلا

دل لگایا تو ہوئے دل کے ہزاروں ٹکڑے
پھول سمجھا تھا جسے میں نے وہ نشتر نکلا

صاف گوئی سے کبھی باز نہ آیا طاہر
گویا وہ میری طرح آئینہ پیکر نکلا

طاہر حسین طاہر
مکان نمبر ۲-۷-۶۴، کھڑگ پورہ، ناندیڑ (مہاراشٹر)
موبائل: 8087570387

Scanned with CamScanner

غزل

کُھلا رہا درِدشت بلا ہمارے لئے
حصار باندھتی کتنی دعا ہمارے لئے

چہار سمت سے گو موجِ تند اُٹھتی ہے
محافظت کو بہت ہے خدا ہمارے لئے

سیاہ رات رگ و پے میں جب اتر آئی
تو روشنی کا کئی در کھلا ہمارے لئے

ہمارے شہر کا ماحول حبس آگیں ہے
ذرا اِدھر سے گذرائے ہوا ہمارے لئے

ہے کیا سبب کہ کوئی راہ خوش نہار نہیں
کبھی تھا نیل میں رستہ بنا ہمارے لئے

اک آئینہ جسے پتھر بنا کے چھوڑ دیا
بہت مضر ہے کسی سے وفا ہمارے لئے

یہ کس گنہ کے خطاوار ہم نثاؔر ہوئے
اتر رہی فلک سے بلا ہمارے لئے

احمد نثار
کڈس کیمپس اسکول، محمد علی روڈ، سٹی کالونی، دھنباد (جھارکھنڈ)
موبائل: 8409242211

غزل

ہر سو ہنگامہ یہ بپا ہے کیا
شہر میں کچھ نہ کچھ ہوا ہے کیا

جھوٹ چہرے کا کھل گیا ان پر
سامنے ان کے آئینہ ہے کیا

چیخ ہی چیخ کی صدائیں ہیں
جھانک کر دیکھ لو ہوا ہے کیا

خوف انساں سے کھا رہا انساں
آدمی شیر بن گیا ہے کیا

توڑنا اور جوڑنا دل کا
بس یہی تیرا مشغلہ ہے کیا

جی رہا ہے جو سنگ کی صورت
تیرا احساس مر گیا ہے کیا

کھولتا کیوں نہیں ظفرؔ آنکھیں
خوف کوئی سما گیا ہے کیا

ظفر اقبال ظفرؔ
170، خیلدار، فتح پور
موبائل: 7379512431

Scanned with CamScanner

غزل

جس دن سے تو نے پھیر لی ہے چشم التفات
پتے کی طرح ٹوٹ کے بکھری مری حیات

بڑھنے لگا ہے جب سے ترا حسن التفات
لگنے لگی ہے مجھ کو حسیں تر یہ کائنات

ایسی بھی راہِ عشق میں آتی ہیں مشکلات
مشکل سے بنتے بنتے ہی بنتی ہے ان سے بات

ان سے بچھڑ کے عشق میں لگتا ہے یہ ہمیں
ویراں ہر ایک دن ہے تو سونی ہر ایک رات

کچھ وہ بھی ہیں خموش سے کچھ ہم بھی ہیں خموش
نظروں سے ہو رہی ہے بیاں دل کی واردات

حیراں ہیں ہم ادھر تو پریشاں ہیں وہ ادھر
کوئی ہمیں بتائے یہ نازک سی نفسیات

اخترؔ اسیر زلف کے تو ہو گئے مگر
یہ سوچتے ہیں کیسے ملے گی ہمیں نجات

اخترؔ ریاض
ایڈیشنل کمشنر، جھانسی
موبائل:

غزل

زندگی جو خدا سے پائی ہے
وہ بھی اپنی نہیں پرائی ہے

اس میں غیروں کا کچھ قصور نہیں
آگ اپنوں نے ہی لگائی ہے

تم نے کانٹوں سے زخم کھائے ہیں
تم نے پھولوں سے چوٹ کھائی ہے

اس سے اچھا تھا زہر کھا لیتے
چوٹ جو آج ہم نے کھائی ہے

اس کے جانے کا کیوں کریں شکوہ
ساتھ میں کب وہ میرے آئی ہے

جب زمانہ برا سمجھتا ہے
تم نے سمجھا تو کیا برائی ہے

پڑھ کے تاریخ قتل کی دیکھو
پہلا قاتل جہاں میں بھائی ہے

جواد حیدر جوادؔ
پورہ باغ، مبارکپور، اعظم گڑھ
موبائل: 8090964952

Scanned with CamScanner

شیخ چھجو

ذاکر حسین ذاکر

شانتی نگر وارڈ، وارڈ نمبر ۷
نزد سنت پشپا اسکول، دیوریا
رابطہ: 9415276138

تم کوہی کے راجہ ویر وکرم بہادر سنگھ کئی سال بعد پورے لاؤلشکر کے ساتھ نرائن پور کوٹھی آئے ہوئے تھے۔ کوٹھی پر ان کے نزول سے علاقے میں ہنگامہ برپہ ہوگیا تھا۔ اچانک آس پاس کے گاؤں میں بے چینی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ یہ بے قراری اور بے چینی اسی طرح کی تھی جیسے پر سکون تالاب میں کسی نے بڑا سا پتھر پھینک دیا ہو۔ لگان نہ چکانے والے کسانوں میں افراتفری مچ گئی۔ بڑے بقائے دار ادھر ادھر چھپنے لگے۔ راجہ صاحب کی فکر بھی واجب تھی۔ اس بار اہلکاروں نے لگان وصولی کی جو تفصیل ان کے سامنے پیش کی اس نے ان کے کان کھڑے کر دئے۔

انہوں نے اہلکاروں اور ہرکاروں کو خوب ڈانٹ پلائی۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو لگان کی وصولی بڑھنے کے بجائے کم ہو جائے گی۔ لگان وصول نہیں ہوگا تو اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ انگریزی سرکار کی مطلوبہ رقم جمع نہیں ہو پائی تو سرکار کی طرف سے الگ جانچ بٹھائی جائے گی۔ کچھ بھی ہو لگان کی وصولی میں تخفیف نا قابل برداشت ہے۔

صرف علاقے میں ہی نہیں بلکہ کوٹھی میں بھی ہنگامہ کھڑا تھا۔ صاف صفائی کا دور چل رہا تھا چاروں طرف گملے آراستہ کئے جا رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اجاڑ سی رہنے والی کوٹھی آباد ہونے لگی وہاں ایک خوشنما ماحول قائم ہونے لگا۔ باورچی دیوان وزیر ہرکارے اور دیگر اہلکاروں کی ٹیم پہلے سے موجود تھی انہوں نے اپنا کام تیزی سے شروع کیا۔ مخبروں کو بھیج کر بقائے داروں کا پتہ لگایا جا رہا تھا۔

لگان وصول کرنے والے ہرکاروں کی کئی ٹیمیں کوٹھی کے آس پاس کے گاؤں میں گھومنے لگیں۔ ہاتھ میں بڑے بقائے داروں کی لسٹ تھی جن کے بارے میں راجہ صاحب کا حکم تھا کہ انہیں اس بار ان کے سامنے ضرور پیش کیا جائے۔ چنانچہ ان کی دھر پکڑ شروع ہوگئی۔

اس دن ایک درجن لوگ پکڑ کر لائے گئے تھے۔ سارے بقائے داروں کی مشکیں باندھ کر لایا گیا اور باورچی خانہ کے جنوبی کونے پر بانس کے جھرمٹوں میں پٹک دیا گیا۔

شیخ چھجو صبح ہی گھر کے قریب کھیت سے پکڑ لئے گئے۔وہ علاقے کے بڑے بقائے داروں میں سے تھے۔اس بار ہرکاروں نے بڑی چالاکی سے شیخ کو پکڑ ا تھا۔انہیں راجہ صاحب کے کوٹھی پر آنے کی خبر تو تھی مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہرکارے ان پر ہی ہاتھ صاف کرلیں گے۔کوٹھی پر جتنے بھی اہل کار عہدے دار اور عملہ فعلہ تھا وہ سارے کے سارے شیخ کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان سے اکثر فیض یاب بھی ہوتے رہتے تھے۔لگان وصول کرنے والے چھوٹے موٹے اہلکاروں کو تو وہ پلک جھپکتے میں چکما دے دیا کرتے تھے اس لئے انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ وہ پکڑ لئے جائیں گے۔شیخ کے گھر میں ان کے پکڑے جانے کے بعد ماتم چھا گیا۔سارے لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔شیخائن بھی آنگن میں اداس سر پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے چاروں طرف ملول چہرے کے ساتھ کھڑے تھے۔کسی کو کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔کسی کو پتہ نہیں تھا شیخ کب چھوٹے گیں اور ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔انہیں کتنی اذیت دی جائے گی۔25 بیگھا کے کاشت کار شیخ چھجو کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔علاقے میں ان کی چالاکی اور عقلمندی کی طوطی بولتی تھی۔ دروازے پر چار بیل دو بھینس ایک گھوڑا ہر وقت بندھے رہتے تھے۔ایک بیل گاڑی تھی جو نقل وحمل کے کام آتی تھی۔آس پاس کے 25 گاؤں میں بغیر ان کے پنچایت نہیں ہوتی تھی۔گاؤں کے چاروں طرف پھیلے ان کے کھیتوں میں آدھا درجن کنوا تھا۔جس سے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے کھیتوں کی بھی آبپاشی ہوتی تھی۔

مگر لوگ شیخ کو مہمان کنجوس کہتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔خود تو پورا جاہل تھے۔الف بے کی ایک حرف کی پہچان مشکل تھی۔مگر اپنے دونوں ہونہار لڑکوں اور بھتیجوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ان کے لڑکے اور بھتیجے قریب کے اردو مڈل اسکول میں زیر تعلیم تھے۔دین اسلام پر ان کا ایمان صرف رسمی تھا۔وہ مسجد کا بھی کبھی رخ نہیں کرتے۔انہیں جب کبھی اللہ کی یاد آتی اس کی مخلوق کی خدمت کر دیتے۔وہ خلق اللہ کی خدمت دامے درمے اور سخنے کرتے رہتے۔اس وجہ سے ان کی شخصیت لوگوں کی نظروں میں بڑی پرکشش تھی۔ وہ پنچایت بھی تو بڑی ایمانداری سے کرتے تھے۔ ان کی انصاف پروری کی وجہ سے دور دور سے انہیں لوگ بلانے آتے۔زندگی گزارنے کا ان کا طریقہ بڑا نرالا تھا۔ان کی ذات سے جڑی کئی کہانیاں آس پاس کے گاؤں میں مشہور تھیں جسے لوگ چٹخارے لے کر سناتے تھے۔ساون میں دھان کی فصل لہلہا رہی ہوتی اور کسانوں کے پاس زیادہ کام نہیں ہوتا تو کسان دور دراز کی اپنی رشتے داریوں میں گھومنے نکل جاتے ہیں۔ایک بار کا وقعہ ہے شیخ ایسے ہی کسی ساون کے مہینے میں رشتے داری کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔اپنے سمدھیانہ، سسرال، ننہال جیسے رشتے داریوں میں 18 دن تک گھومتے رہے۔جس دن وہ گھوم گھام کر واپس آئے اسی دن ان کے گھر ان کے چھوٹے لڑکے مہربان کی شادی کے لئے 18 مہمان آگئے۔شیخ مہمانوں کو دیکھ کر چونکے۔جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ مہمان ان کے لڑکے کے رشتے کے لئے آئے ہیں دوپہر کا کھنا بھی کھائیں گے۔ناشتہ شربت اور گڑ پیش کرنا پڑے گا یہ سوچ کر وہ چکرا گئے۔آنگن میں جا کر اپنی شیخانی کو کیا کہتے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ان کے چہرے پر مایوسی کی لمبی چادر تن گئی تھی۔

شیخانی بہت ناراض ہوئیں۔'' میرے بیٹے کی شادی کے لئے مہمان آئے ہیں اور آپ اداس ہو کر بیٹھ گئے۔آپ کو خوش ہونا چاہیے۔لہہ لہہ ٹھہہ ٹھہہ کرنا چاہے۔ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔جائیے مہمانوں کی مہمان نوازی کیجئے۔''شیخانی نے تھوڑی سختی سے کہا۔

شیخ نے بڑے اداس لہجے میں شیخانی سے کہا ''چھجو کیا خوشی منائے۔اتنی محنت سے 18 دن رشتے داری میں گھوم کر جو کھانا بچایا تھا اسے ایک ہی دن میں مہمان کھا جائیں گے۔میں سمجھوں گا نا چھجو کہیں گئے نہ آئے گھر ہی رہ گئے۔'' شیخ کی بچت کا یہ طریقہ لوگوں کو بہت پسند آیا۔اسی دن سے لوگ چھجو کو کنجوس کہنے لگے۔جب کنجوسی کی بات ہوتی تو لوگ کہتے کہ'' نا چھجو کہیں گئے نا آئے مجھو گھر ہی رہ گئے۔''

شیخ روپئے پیسے کو بہت ترجیح دیتے تھے۔کپڑے لتے پر بھی وہ زیادہ خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے مگر کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔شیخانی بھی بڑے گھر کی بیٹی تھیں وہ شیخ اور اپنے بچوں کو بخوبی سنبھالتی تھیں۔بھوکے اور محتاج شیخانی کے دروازے سے واپس نہیں جاتے تھے۔شیخ کی سب سے بڑی کمزوری زمین تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ زمین بنا لینا چاہتے تھے۔مگر لگان ان کے سامنے بہت بڑا مسئلہ تھا جو ان کی خواہش کی تکمیل نہیں ہونے دیتا تھا۔زمین تو وہ سو بیگھا زمین بنالیں مگر لگان کہاں

سے دیں گے اس کے متعلق سوچا کرتے تھے۔آج جب ان کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور وہ زمین پر پڑے ہوئے تھے ان کے ذہن میں لگان معافی کے متعلق کئی طرح کے خیالات آرہے تھے۔

راجہ صاحب اپنے دیوان سکھرام سنگھ کے ساتھ دیوان خانے میں بیٹھے کام کرتے رہے۔وہ دیوان صاحب سے پچھلے سال کی پیداوار کے متعلق حساب کتاب سمجھ رہے تھے۔چار پانچ منشیان چاروں طرف پنسل اور کاغذ لے کر جوڑ گھٹانے میں مصروف تھے۔کتنی دھان کی پیداوار ہوئی۔کتنا لگان کس گاؤں سے آیا۔آموں کے باغ سے کتنی رقم وصول ہوئی۔دیوان سکھرام کی بھی حالت نازک ہو رہی تھی۔حساب میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔آمدنی اور خرچ کے ہندسوں میں تفریق نہ ہونے پائے۔ان کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔ایسا نہ ہو کہ ان کی بے ایمانی پکڑ میں آجائے ورنہ لگان کے بقائے داروں سے پہلے ان پر گاج گرنی طے ہے۔رسوئی گھر میں مہاراج دین دیال بھگت کھانا پکانے میں مصروف تھے۔کئی طرح کی سبزیاں پک چکی تھیں۔دال میں بگھار لگانا باقی تھا۔باس متی چاول پک رہا تھا۔پرانے باس متی چاول کی خوشبو بھوکے بقائے داروں کے نتھنوں میں داخل ہو کر ان کی اشتہا کو مزید بڑھا رہی تھی۔جب بھوک کی شدت تیز ہو تو کھانے کی مہک بہت زیادہ پریشان کرتی ہے۔بقائے داروں کو صرف خوشبو پر ہی اکتفاء کرنا پڑ رہا تھا۔کھانا تو دور کی بات تھی انہیں تو صبح سے پانی بھی نصیب نہیں ہوا تھا، اور یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔کب ان کی رہائی ہوگی اور کب ان کے منہ میں پانی کی بوند جائے گی۔

سورج سر کے اوپر تک آگیا تھا۔راجہ صاحب کام ختم کر کے اٹھ چکے تھے۔کھانے کا وقت قریب آرہا تھا۔کھانے کے بعد ہی بقائے داروں سے باز پرس ہونی تھی۔آج دیوان سکھرام بھی راحت کی سانس لے رہے تھے اور منشی لوگ بھی خوش تھے کہ ان کی کارکردگی پر کوئی سوال نہیں کھڑا ہوا۔اسی طرح کئی سال پہلے کی

راجہ صاحب اپنے دیوان سکھرام سنگھ کے ساتھ دیوان خانے میں بیٹھے کام کرتے رہے۔وہ دیوان صاحب سے پچھلے سال کی پیداوار کے متعلق حساب کتاب سمجھ رہے تھے۔چار پانچ منشیان چاروں طرف پنسل اور کاغذ لے کر جوڑ گھٹانے میں مصروف تھے۔کتنی دھان کی پیداوار ہوئی۔کتنا لگان کس گاؤں سے آیا۔آموں کے باغ سے کتنی رقم وصول ہوئی۔دیوان سکھرام کی بھی حالت نازک ہو رہی تھی۔حساب میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔آمدنی اور خرچ کے ہندسوں میں تفریق نہ ہونے پائے۔ان کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔ایسا نہ ہو کہ ان کی بے ایمانی پکڑ میں آجائے ورنہ لگان کے بقائے داروں سے پہلے ان پر گاج گرنی طے ہے۔

بات ہے ساون کے مہینے میں راجہ صاحب کوٹھی پر آئے ہوئے تھے۔وہ ابھی جوان تھے۔انہوں نے حساب کتاب کے بعد کھانا کھایا اور تھوڑی دیر قیلولہ کیا۔صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی۔سہ پہر کو بارش تھم گئی۔ماحول خوشنما ہو گیا۔پیڑ پودے دھلے دھلے معلوم ہونے لگے۔ہر چیز صاف ستھری نکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔آسمان میں کالے بادل کسی مشاق رقاصہ کی طرح ناچ رہے تھے۔راجہ صاحب چہل قدمی کے لئے نکلے۔دیوان سکھرام اور منشی دیا نرائن، منشی ٹیک چند، منشی دھنی رام، منشی خدا بخش ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔کوٹھی کے باہر میدان میں گاؤں کے چرواہے اور گھاس کاٹنے والے لڑکے چکہ کھیل رہے تھے۔راجہ صاحب لڑکوں کا کھیل دیکھنے لگے۔پیچھے چل رہے نوکروں کو جب علم ہوا کہ راجہ صاحب چکہ دیکھیں گے تو دوڑ کر کرسی لائے۔راجہ صاحب بیٹھ کر چکہ دیکھنے لگے۔اس کھیل میں راجہ صاحب کو کافی دلچسپی ہوگئی۔جب شام ہونے لگی تو لڑکوں نے کھیل بند کر دیا۔

''کھیل جاری رکھو'' راجہ صاحب نے لڑکوں کو حکم دیا۔

''مائی باپ اب جانے دیا جائے۔جانوروں کے لئے کچھ چارا گھاس بھی کاٹنا ہے نہیں تو ہمارے جانور بھوکے رہ جائیں گے۔''لڑکوں نے راجہ صاحب سے فریاد کی۔

''تم کھیلتے رہو۔شام کو ہمارے کھیت سے گھاس کاٹ لینا۔''راجہ صاحب نے کہا۔

لڑکوں نے پھر کھیلنا شروع کر دیا۔جب اندھیرا ہونے لگا تو راجہ صاحب نے کہا'' جاؤ کھیت میں سے گھاس کاٹ لو۔''لڑکوں نے ان کے کھیت میں سے ایک ایک گٹھر کودو، ٹانگن اور باجڑا کاٹ لیا۔جب کھلاڑی کھیت سے چارا کاٹ رہے تھے۔دیوان سکھرام کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ان میں راجہ صاحب کی حکم عدولی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔انہوں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا مگر جب ایک درجن لڑکے کودو ٹانگن اور باجڑے کی فصل کا گٹھر بنا کر اپنے سروں پر رکھ کر چلے گئے تو دیوان صاحب نے

Scanned with CamScanner

راجہ صاحب کے کان میں کہا کہ حضور لڑکوں نے ساڑھے تین سو روپئے کی کی فصل کاٹ لیا۔ دیوان صاحب نے یہ جملہ راجہ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اوران کی نظروں میں اپنی اہلیت کا سکہ جمانے کے لئے کہا تھا مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔

''دیوان جی آپ کو یہ بات پہلے بتانی چاہیے'' راجہ صاحب نے کہا ''آخر آپ کو اسی کام کے لئے تو رکھا گیا ہے کہ آپ ہمیں بروقت بہتر مشورہ دیں اور فائدہ نقصان کے بارے میں بتائیں۔'' راجہ صاحب ناراض ہوئے۔ دیوان صاحب ان کے تیور دیکھ کر سہم گئے۔

راجہ صاحب نے منشی ٹیک چند کو حکم دیا'' منشی جی دیوان جی نے ساڑھے تین سو روپئے کا نقصان کرایا ہے۔ ہر ماہ ان کی تنخواہ سے یہ رقم قسطوار منہا کر لیجئے۔'' نیک مشورہ دیکر دیوان صاحب برے پھنسے تھے۔ اس کے بعد جب بھی راجہ صاحب کوٹھی پر آتے دیوان سکھرام بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ کوشش کرتے کہ کوئی فضول لفظ ان کی زبان سے نہ نکلنے پائے جس سے لینے کا دینی پڑ جائے۔ آج بھی راجہ صاحب کے ساتھ دیوان سکھرام بہت محتاط تھے۔ جب راجہ صاحب دیوان خانے سے باہر نکل گئے تب دیوان صاحب کی سانس میں سانس آئی۔ منشیان اور دیگر عملے نے بھی راحت کی سانس لی۔ مگر ایسے وقت باورچی خانے میں باورچی دین دیال کی سانس پھول رہی تھی۔ دال بگھار کر جب وہ فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ دال میں نمک زیادہ ہو گیا ہے۔ اہلکاروں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ باورچی راجہ صاحب کے عتاب سے بچنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ سامنے شیخ چھجوؒ زمین پر لیٹے لیٹے باورچی دین دیال کی پریشانی ملاحظہ کر رہے تھے۔ شیخ کے پاس اس مصیبت سے بچنے کی اچھی ترکیب تھی۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ باورچی دین دیال بھگت کو بچا دیا جائے۔

''ایک کٹورا خالص گھی چولہے پر کرکرا کر دال میں ڈال دیجئے۔ نمک کا اثر زائل ہو جائے

راجہ صاحب نے منشی ٹیک چند کو حکم دیا'' منشی جی دیوان جی نے ساڑھے تین سو روپئے کا نقصان کرایا ہے۔ ہر ماہ ان کی تنخواہ سے یہ رقم قسطوار منہا کر لیجئے۔'' نیک مشورہ دیکر دیوان صاحب برے پھنسے تھے۔ اس کے بعد جب بھی راجہ صاحب کوٹھی پر آتے دیوان سکھرام بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ کوشش کرتے کہ کوئی فضول لفظ ان کی زبان سے نہ نکلنے پائے جس سے لینے کا دینی پڑ جائے۔ آج بھی راجہ صاحب کے ساتھ دیوان سکھرام بہت محتاط تھے۔ جب راجہ صاحب دیوان خانے سے باہر نکل گئے تب دیوان صاحب کی سانس میں سانس آئی۔ منشیان اور دیگر عملے نے بھی راحت کی سانس لی۔ مگر ایسے وقت باورچی خانے میں باورچی دین دیال کی سانس پھول رہی تھی۔ دال بگھار کر جب وہ فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ دال میں نمک زیادہ ہو گیا ہے۔ اہلکاروں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

گا۔'' شیخ نے دین دیال سے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ نمک کا پتہ نہیں چلے گا۔'' انہوں نے کہا'' گھی خوب گرم ہونا چاہئے'' دین دیال نے جلدی جلدی شیخ کے مشورے پر عمل کیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد راجہ صاحب کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ واقعی آج کا کھانا معمول سے کچھ زیادہ ہی لذیذ تھا۔ جب باورچی اور شیخ کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ راجہ صاحب باورچی خانے کے پیچھے موجود تھے۔ انہوں نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ انہوں نے شروع میں تو شیخ اور دین دیال کی گفتگو پر توجہ نہیں دی مگر جب وہ کھانا کھا رہے تھے انہیں دونوں کی گفتگو یاد یاد آ گئی۔ انہیں دال میں گھی کرکرا کر ڈالنے کی اہمیت بھی سمجھ میں آ گئی تھی اور دال کی لذت کا احساس بھی شدید ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد جب بقائے داروں کی سنوائی کا دور شروع ہونے والا تھا۔ راجہ صاحب کو شیخ چھجو کا خیال آیا۔

شیخ چھجوؒ کی مشکیں کھول دو اور انہیں عزت سے یہاں لاؤ'' راجہ صاحب نے نرمی سے منشی ٹیک چند کو حکم دیا۔ ان کے چہرے پر شفقت نمایا تھی۔ لوگ راجہ صاحب کے اس رویئے سے حیران تھے۔ مگر انہوں نے شیخ چھجوؒ کے لئے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ انہوں نے دیوان سکھرام اور منشی ٹیک چند کو بلایا اور حکم دیا۔

''شیخ چھجوؒ کا سارا بقایا لگان معاف کر دیا جائے۔ اگلے تین سال تک شیخ چھجوؒ سے کوئی لگان نہ لیا جائے۔ ان کو 25 بیگھا لگان معاف زمین دے دیا جائے جس میں صرف دھان کی فصل پیدا ہوتی ہو۔'' انہوں نے کہا'' شیخ چھجوؒ کھانے پینے والے آدمی ہیں۔ یہ لگان کی بھاری رقم کہاں سے ادا کریں گے۔ یہ ارہر کی دال کھاتے ہیں گھی کھاتے ہیں۔ جو فصل ہوتی ہوگی وہ ان کے کھانے پینے پر خرچ ہو جاتی ہوگی۔'' انہوں نے دیوان سکھرام کو ڈانٹا'' دیوان جی آپ آدمی نہیں پہچانتے۔''

□□□

Scanned with CamScanner

وہم

سکندر علی شکن

بیرپور

پوسٹ شیودہا، بہرائچ

رابطہ: 9519902612

گاؤں کے مغرب میں تقریبا ایک میل تک آم کے گھنے باغات تھے، باغات کے درمیاں ایک بہت قدیم قبرستان تھا۔ مغرب کے اذان ہونے کے بعد گاؤں کا کوئی بھی فرد اس جانب نہیں جاتا تھا لوگوں کا ماننا تھا کہ رات کے دس بجتے ہی اس قبرستان پہ بھوتوں کی مجلس شروع ہو جاتی ہے سبھی بھوت دن بھر کی اپنی اپنی کارکردگی سناتے ہیں، اس اجلاس کے شور وغل کی صداؤں کو گاؤں کے چند معمر افراد سماعت کر چکے تھے یوں تو گاؤں میں بہت بڑے بڑے سورما تھے جنہوں نے اپنی ہمت اور بہادری سے بہت بڑی بڑی مہم سر کئے تھے مگر اس قبرستان کا ذکر سنتے ہی ان کی سب ہمت و بہادری پست ہو کر رہ جاتی تھی۔ گاؤں کے چوپال پہ بیٹھے چند افراد باغات والے اسی قبرستان کو زیر موضوع کئے آپس میں محوِ گفتگو تھے۔

شانتی کاکی جن کی عمر تقریبا پچاسی سال کے آس پاس رہی ہوگی وہ بھوتوں کے بارے میں یوں بتا رہی تھیں:

'جب میں چھوٹی تھی تو اکثر باغوں میں صبح صبح آم بینے جایا کرتی تھی ایک دن باغ میں، میں نے ایک آدمی دیکھا جو ایکدم سفید کفن کی طرح لباس پہنے کھڑا تھا میں نے اسے آواز دی مگر وہ نہ بولا یکا یک میری نظر اس کے پیروں پہ پڑی تو اس کے پیر مجھے ٹیڑھے دکھے میں چلائی اور سرپٹ گھر آ کر اپنی دادی سے ساری روداد بیان کی تو دادی کہنے لگی کہ وہ بھوت ہے۔'

لکھن چاچا نے شانتی کاکی کی مکمل تائید کرتے ہوئے اپنی بات رکھی۔

'کچھ سال پہلے جمراتی اپنے سسرال سے واپس گاؤں لوٹ رہا تھا اسے رات ہو گئی تھی تقریبا رات کے دس بجے وہ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچا اسکی چیخنے اور چلانے کی آواز سن کر اہل قریہ اس کے گھر پہنچے دیکھا تو اسے پسینے چھوٹ رہے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اس نے بتایا کہ جب وہ باغات والے قبرستان کے پاس سے گزر رہا تھا تبھی ایک بھوت قبر سے نکلا اور حملہ کر دیا کبھی میں اسے پٹکتا تو کبھی وہ مجھے، بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔'

اہل چوپال بھوتوں کی کہانی ایسی معدولیت اور توجہ کے ساتھ سن رہے تھے گویا وہ کسی خطیب کی علم سے لبریز خطاب سماعت کر رہے ہوں۔ یکا یک ایک طرف سے ایک لڑکے کی آواز آئی:

'جھوٹ بالکل جھوٹ! بھوت ہوتے ہی نہیں، یہ تو انسان کا وہم ہے۔'

اہل چوپال کی نظر اس لڑکے پہ بجلی کی طرح چمکی یہ لڑکا سمیر تھا۔ عمر تقریباً بیس بائیس سال کے آس پاس رہی ہوگی چوپال پر بیٹھے کچھ لوگ سمیر سے بگڑ گئے، ایک بزرگ اپنا سر ہلاتے ہوئے سمیر سے مخاطب ہوئے۔

'بیٹا ابھی بھوت کے چکر میں پڑے نہیں ہو، پڑو گے تو ساری ہمت و جواں مردی غبارے کے ہوا کی مانند پھر ہو جائے گی۔'

'چاچا آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟'

'نہیں بیٹا! ہم انتباہ کر رہے ہیں تاکہ تم بھوتوں سے محفوظ رہ سکو واضح رہے بھول کر بھی رات کے وقت اس طرف میں نہ جانا۔' بزرگ سمیر کو سمجھاتے ہوئے بولے۔

'چاچا میں ضرور جاؤں گا میں بھوتوں سے نہیں ڈرتا۔'

گاؤں میں کئی قسم کے لوگ تھے کچھ لوگ سمیر کی تائید کر رہے تھے تو کچھ لوگ مخالفت۔

'ہمت ہے تو آج رات بارہ بجے قبرستان سے ہو کر آؤ۔' ایک شخص نے سمیر کو اکسایا۔

'بالکل ہو کر آؤں گا۔'

'تو ٹھیک ہے ہم تمہیں آج رات ساڑھے گیارہ بجے ایک کھوٹا سکہ بطور ثبوت دینگے تمہیں وہ کھوٹا سکہ قبرستان کے درمیان میں گاڑنا ہوگا۔ ہم سب صبح ہوتے ہی کھوٹا سکہ دیکھنے جائینگے یہ شرط ایک نوعمر شخص نے رکھی۔

'مجھے منظور ہے۔' چوپال پہ بیٹھے چند لوگوں نے سمیر کو سمجھایا کہ وہ قبرستان نہ جائے مگر اس نے سب کی باتیں مسترد کر دی۔'

تقریباً رات کے ساڑھے گیارہ بجے گاؤں کے چند منچلے تماشائی لوگوں کے ذریعہ اسے ایک کھوٹا اور ہاتھوڑا دے دیا گیا۔

سمیر چادر اوڑھے ہوئے ایک ہاتھ میں

سمیر چادر اوڑھے ہوئے ایک ہاتھ میں کھوٹا اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا لیے قبرستان کی جانب چل پڑا، سردی کا موسم تھا رات اپنی شباب پہ تھی ہر طرف گھنگھور کہرہ برس رہا تھا ہر سمت تاریکی ہی تاریکی تھی ایسا لگتا تھا گویا یہ رات قیامت کی رات ہو مگر سمیر کے اندر خوف نام کی کوئی چیز نہ تھی وہ ٹھنڈ سے کانپتا ہوا پیہم راستہ طے کرتے ہوئے آدھا باغات پار کر چکا تھا قبرستان قریب تھا یکا یک تیز ہوائیں چلنے لگیں ہوا کے جھونکو سے پتیاں اڑنے لگیں پتیوں کی کھرکھراہٹ نے سمیر کے کان کھڑے کر دیے اسے تھوڑا سا ڈر محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ لگا کہ کہیں یہ بھوتوں کی حرکت تو نہیں ذہن میں یہ خیال آتے ہی اسے چوپال کی تمام باتیں مثلاً شانتی کا کی، جمعراتی وغیرہ یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے اس کے جسم میں خوف لہو بن کر دوڑنے لگا خیر وہ خود کو سنبھالتے ہوئے قبرستان کے درمیاں پہنچ گیا۔

کھوٹا اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا لیے قبرستان کی جانب چل پڑا، سردی کا موسم تھا رات اپنی شباب پہ تھی ہر طرف گھنگھور کہرہ برس رہا تھا ہر سمت تاریکی ہی تاریکی تھی ایسا لگتا تھا گویا یہ رات قیامت کی رات ہو مگر سمیر کے اندر خوف نام کی کوئی چیز نہ تھی وہ ٹھنڈ سے کانپتا ہوا پیہم راستہ طے کرتے ہوئے آدھا باغات پار کر چکا تھا قبرستان قریب تھا یکا یک تیز ہوائیں چلنے لگیں ہوا کے جھونکو سے پتیاں اڑنے لگیں پتیوں کی کھرکھراہٹ نے سمیر کے کان کھڑے کر دیے اسے تھوڑا سا ڈر محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ لگا کہ کہیں یہ بھوتوں کی حرکت تو نہیں ذہن میں یہ خیال آتے ہی اسے چوپال کی تمام باتیں مثلاً شانتی کا کی، جمعراتی وغیرہ یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے اس کے جسم میں خوف لہو بن کر دوڑنے لگا خیر وہ خود کو سنبھالتے ہوئے قبرستان کے درمیاں پہنچ گیا اور جلدی جلدی کھوٹا گاڑنے کرنے لگا جب وہ کھوٹا گاڑ چکا تو اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ بھوتوں کے نرغے میں گھر گیا ہو خوف کے مارے اس کے جسم کے رونگٹے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس نے پوری طاقت سے چادر جھٹک دی اور چلاتے ہوئے گاؤں کی طرف سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

گھر پہنچتے پہنچتے اسکی حالت خراب ہو گئی وہ بخار سے تپ رہا تھا جاڑے سے کانپ رہا تھا اس کو چار رضائیاں اڑھائی گئی اہل قریہ اسکی عیادت کو آنے لگے۔ لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔

'اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھتا تھا بل گئی نا سب ہمت خاک میں، ہو گیا نا وصال بھوت سے سرفراز۔'

صبح ہوتے ہی گاؤں کے چند لوگ قبرستان پہنچے تو انہیں سمیر کی چادر کھوٹے سکے کے ساتھ زمین میں گڑی نظر آئی بات لوگو کے سمجھ میں آ گئی کہ اسکے اوپر بھوتوں نے نہیں بلکہ وہم نے حملہ کر کے اسے خوف زدہ کر دیا جس سے وہ جلد بازی میں کھوٹے سکے کو اپنی چادر ہی پہ ٹھوک لیا۔

□□□

اشتہاری شاعر

ساجد جلالپوری

محلہ جعفرآباد، جلالپور
امبیڈکرنگر (یوپی)
رابطہ: 9415581432

ہمارے اس عنوان سے آپ یہ خوف نہ کھائیں کہ ہم شاعروں کو اشتہاری مجرم کی طرح عدالت میں یا ''موسٹ وانٹیڈ'' ملزم کی طرح حوالات میں کھڑا کر رہے ہیں۔ ماشاء اللہ ہمارے شعراء محترم ہیں۔ ان کے دامن پر اس قسم کے داغ کا کوئی شائبہ نہیں۔ ہاں شاعری کی الجھنوں میں ان کا دامن مثل قیس تار تار مل سکتا ہے داغ دار نہیں۔ کیوں کہ ان پر شرافت کا ٹھپہ ہے شرارت کا دھبہ نہیں۔ یہ بہت معصوم مخلوق ہیں۔ ہاں اب اگر کسی مشاعرے میں اوچھی حرکتیں کرنے والے اسٹیج پر مل جائیں تو انہیں فوراً متشاعروں کے خانے یا کسی نزدیکی تھانے میں ڈال سکتے ہیں یہ انہیں کے کارنامے ہو سکتے ہیں۔

چونکہ آج کا دور اشتہارات کا ہے جب کوئی ساز وسامان، انسان، حیوان، مصنع (فیکٹری)، مطبع، مزرع، بغیر اشتہار کے نہیں چل سکتا تو شاعروں کا مطلع و مقطع کیسے چلے۔ ہاں کوئی عورت بغیر برقع کے چلے تو چلے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ عطار کو بتانا ہی نہیں پڑتا تھا کہ میں مُشک فروخت کر رہا ہوں بلکہ خود مشک مہک کر اپنے مالک کی نشاندہی کر دیتی تھی لیکن زمانہ آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے ترقی کی معراج پر پہونچ گیا تو شعراء کی فکریں بھی سدرۃ المنتہٰی سے گذر کر ''قاب قوسین'' سے ٹکرانے لگیں تو اشتہار کی ضرورت پڑ گئی۔

موجودہ دور میں نئے نئے انقلاب آئے۔ سبز انقلاب، سرخ انقلاب، سفید انقلاب، سیاہ انقلاب وغیرہ۔ اب شعراء انقلاب لانے میں پیچھے کیوں رہیں۔ لہٰذا اشتہاری انقلاب بھی لے آئے۔ دراصل ہمارے شعراء کو خود کی شناخت کرانے کا بڑا شوق ہے اور اس کا سب سے آسان راستہ مشاعروں کا اسٹیج ہے جہاں تک رسائی بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ کیوں کہ سارے وتیج، نان وتیج، نیرو گیج، براڈ گیج سے گزر کر ہی اسٹیج پھولوں کا سیج بنتا ہے۔ اس کے زینہ تک رسائی کے لئے خون کو پسینہ بنا کر بہانا پڑتا ہے۔

Scanned with CamScanner

شعراء اشتہار میں اپنا نام دیکھ کر نہایت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بلفظ اختصار، اشتہار کا انتظار کسی تیوہار سے کم نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس میں شامل ہونے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے تو لگا سکتے ہیں۔ کسی مخالف کو راستے سے ہٹانا پڑے تو ہٹا سکتے ہیں۔ کیونکہ آگے بڑھنے کے لئے نہ صرف کچھ کرنا پڑ سکتا ہے بلکہ سیاسی لیڈروں کی طرز پر خون خرابہ بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

بقول راحت اندوری

جو لوگ بہ ظاہر قد و قامت میں بڑے ہیں
وہ لوگ زمیں پر نہیں لاشوں پہ کھڑے ہیں

اس شعر سے یہ مراد نہ لیں کہ ہم پولیس کی طرح بے قصور شعراء کو تانگوں کے حضور پیش کر رہے ہیں۔ نہیں۔ یہ قبیلہ اتنا سادہ لوح و شریف النفس ہوتا ہے کہ فقط داد و تحسین کے کلمات پر مثل طاؤس محو رقص ہوتا ہے اور ویسے بھی یہ مقتول قوم ہیں جن کو قتل کرنے کے لئے محبوبہ کی نازک ادائیں ہی کافی ہیں۔

چونکہ یہ دور نئی نئی ایجادات کا ہے لہٰذا شعراء نے بھی نئی نئی تکنیک کے اشتہارات سے خود کو منسلک کیا۔

ایک شاعر اس مزاج کے ہیں جو بہ ذات خود مغل اعظم ادب کے سامراج کے ہیں۔ انہیں خود کو اشتہار کے آئینہ میں دیکھنے کا بڑا شوق ہے کہ انہیں لوگ ''اشتہار کھوج'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اگر کسی مشاعرے، نشست میں ان کا نام نظر نہیں آتا تو صاحب مشاعرے کو تلاش کر اپنی شکایت درج کرا اپنا نام زبردستی شامل کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ چاہے مجھ کو مشاعرہ میں مدعوت کیجئے، اسٹیج پرمت بٹھائیے لیکن کم سے کم میرا نام تو شامل ہو جائے تاکہ شہر والوں کو میرے قد و قامت کا اندازہ ہو سکے کہ میں کتنا عظیم شاعر ہوں۔ انہیں اشتہار میں نام درج کروانے کی اتنی بری عادت لگ گئی ہے کہ جیسے بعض نوجوانوں کو نشہ آور ادویات کی۔ اسی لئے وہ جیب میں پرکار و مختلف اوزار لے کر گھومتے ہیں۔ اور اگر صاحب مشاعرہ انکار کرتا ہے تو میرے یہاں آپ کی شعری آزمائش کی گنجائش نہیں ہے، محضر شعراء میں آپ کا نام درج نہیں ہو سکتا۔ اس میں کچھ خاص منتخب، مستند، برگزیدہ، سن رسیدہ اور پاور فل شخصیات ہی مدعو ہیں تو اس وقت وہ جوش کو ہوش میں لا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور پھر رات کی تنہائی یا دن کے سناٹے میں منزل مقصود پر پہونچ کر پرکار سے دائرہ بنا کر اس میں اپنا نام درج کر دیتے ہیں۔ جب عوام و خواص صبح اٹھ کر اشتہار پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ کرامت دیکھ کر حیران و ششدرہ جاتے ہیں۔ اور ان کی باطنی بے حیائی و ظاہری خود نمائی کے قائل ہو کر ان کی ادائے اشتہاری سے گھائل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اشتہار میں جگہ کی کمی کی وجہ سے اپنا اسم گرامی گرم نہیں کر پاتے۔ بیچارے اب کیا کریں۔ مایوس ہو کر کہتے ہیں کتنا بخیل اور کنجوس ہے یہ شخص۔ میرا ابھی خیال نہیں رکھا۔ اور جگہ بھی اتنی تنگ کہ میں اشتہاری جنگ نہ کر سکوں۔ یہ کہہ کر لعن طعن کرتے ہوئے اپنا دست کرخت اشتہار پر لے جا کر احتجاج درج کرتے ہوئے اس کو پھاڑ ڈالتے ہیں۔ عوام کے درمیان یہ خبر اکثر گردش کرتی ہے کہ شہر میں جو اشتہارات پھٹے ہوئے مل رہے ہیں، قسم ہے رب اشتہار کی یہ اسی ''اشتہاری مریض'' کی یادگار ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ کسی زمانے میں کتابت سے وابستہ تھے اس لئے خوش نویس ہیں لیکن کمپیوٹر کی ایجاد سے بے روزگار ہو کر فن کتابت سے بیزار ہو گئے اور اپنا غصہ اتارنے کے لئے شعر و شاعری میں سرشار ہو گئے۔ کہتے ہیں اسکول کے زمانے میں لاپرواہی کے طفیل کئی بار فیل ہوئے لیکن ان کو اقلیدس میں بہت دلچسپی تھی ''ریکھا گرت'' میں ماہر تھے بلکہ اداکارہ ''ریکھا'' کے یک طرفہ عاشق باطن و ظاہر تھے۔ اس لئے ان کو پوسٹر میں مستطیل، مثلث، مربع، دائرہ بنانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی دفعہ امتحان میں فیل ہونے کے باوجود اشتہاری امتحان میں پاس ہو گئے۔ اب اپنا نام اشتہار میں دیکھ کر خوشی کا اظہار ایسے کرتے ہیں

ایک شاعر اس مزاج کے ہیں جو بہ ذات خود مغل اعظم ادب کے سامراج کے ہیں۔ انہیں خود کو اشتہار کے آئینہ میں دیکھنے کا بڑا شوق ہے کہ انہیں لوگ ''اشتہار کھوج'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اگر کسی مشاعرے، نشست میں ان کا نام نظر نہیں آتا تو صاحب مشاعرے کو تلاش کر اپنی شکایت درج کرا اپنا نام زبردستی شامل کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ چاہے مجھ کو مشاعرہ میں مدعوت کیجئے، اسٹیج پرمت بٹھائیے لیکن کم سے کم میرا نام تو شامل ہو جائے تاکہ شہر والوں کو میرے قد و قامت کا اندازہ ہو سکے کہ میں کتنا عظیم شاعر ہوں۔ انہیں اشتہار میں نام درج کروانے کی اتنی بری عادت لگ گئی ہے کہ جیسے بعض نوجوانوں کو نشہ آور ادویات کی۔ اسی لئے وہ جیب میں پرکار و مختلف اوزار لے کر گھومتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

گویا حشر میں صراط سے پار ہو گئے ہوں۔اس لئے ان کی دیرینہ خواہش رہتی ہے کہ روزانہ کہیں نہ کہیں مشاعرہ برپا ہو کیوں کہ جب مشاعرہ برپا ہوگا تو داد و تحسین سے حشر برپا کریں گے۔ویسے اگر قیامت برپا کرنے کی اتھارٹی حضرت اسرافیل کے صور میں ہے تو قیامت سے پہلے قیامت کی ذمہ داری شاعروں میں شعور میں ہے۔اسی لئے اکثر شعراء کو دیکھا گیا ہے کہ جب کچھ دن کوئی نشست نہیں ہوتی، قحط سالی کا موسم رہتا ہے تو بڑے بے چین ہو جاتے ہیں۔بھاگ دوڑ، جگاڑ سے تجار، لیڈرس کو پکڑ کر ایک عدد مشاعرہ پر راضی کر لیتے ہیں۔ایک نقاد کے بقول یہ سرمایہ داروں کے ذہنوں میں ادبی جراثیم اور اشتہار میں راتوں رات اپنا اسم عظیم اتنی چالاکی، خاموشی سے داخل کرتے ہیں جیسے صحت مند آدمی کے جسم میں بیماری کا وائرس۔

بعض شعراء اپنا ''وزیٹنگ کارڈ'' شائع کر کے اس پر تعلیمی لیاقت، نزاکت، منصب، مکتب، مشغولیات، مصروفیات، محب اردو، طوالت گیسو، شہنشاہ ترنم، بادشاہ تکلم، بزم سخن، شاعر گنگ و جمن، بانیٔ انجمن، محب وطن وغیرہ جیسے فرضی و حقیقی عہدے تحریر کرا اپنا پرچار کرتے ہیں۔جن کے پاس اس قسم کا کوئی لاحقہ و سابقہ نہیں ہوتا وہ کارڈ پر صرف ''شاعر'' لکھ کر حصول مشاعرہ کی مشین سمجھ کر اپنی ذہنی تسکین کرتے ہیں۔اور مشاعروں میں سبحان اللہ مکرر ارشاد اور اچک اچک کر داد دینے والے سامعین و منتظمین کے گلے میں بغیر مانگ کے ٹانگ دیتے ہیں۔ تا کہ اسی بہانے مدعو کرنے والے میزبان آسانی سے مل جائیں۔یہ بھی خدمت اردو کا ایک جذبہ ہے۔

بعض شاعر اپنے غریب خانہ پر ''نیم پلیٹ'' کھانے کی پلیٹ (مینو) جملہ اسناد کی نقول، نذرانوں کی قبض وصول، عروض کا پیمانہ فعولن فعول، مشاعروں میں پہنا ہوا مرجھایا پھول تک سجا کر رکھتے ہیں۔بعض اپنے مکان کے صدر دروازے پر اپنی قد آدم تصویر کی اس طرح نمائش کرتے ہیں جیسے مقبول فدا حسین مرحوم اپنے گھر کے اندر مادھوری دیکشت کی ''قد حوا'' تصویر اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیدار کرتے تھے۔

ایک شاعر کے بقول ان اعمال و افعال سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان سے مشاعرے اسی طرح پھنستے ہیں جیسے ندیوں، تالابوں میں جال لگانے سے مچھلیاں۔

اشتہارات میں شعراء کی تصویریں بولتی ہیں تو ان کے خدو خال پر تنقیدیں، تمہیدیں، ساعتوں میں رس گھولتی ہیں بلکہ دخول مشاعرہ کے بہت سے راز سربستہ کھولتی بھی ہیں۔گویا اشتہار شعراء کا نہ صرف قد و قامت، ضخامت، جسامت، قدامت، عشرت، عسرت، تنگ دستی، بالا دستی، بلکہ ماضی، حال، مستقبل تک بتا دیتے ہیں۔یعنی اگر کوئی اپنے پسندیدہ شاعر کے حالات کا برسوں بعد دیدار اور مشاعروں کا اودار دیکھنا چاہے تو دیوار کو کرید کر سہارا لے سکتا ہے۔

ایک شاعر کے بقول ان اعمال و افعال سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان سے مشاعرے اسی طرح پھنستے ہیں جیسے ندیوں، تالابوں میں جال لگانے سے مچھلیاں۔

اشتہارات میں شعراء کی تصویریں بولتی ہیں تو ان کے خدو خال پر تنقیدیں، تمہیدیں، ساعتوں میں رس گھولتی ہیں بلکہ دخول مشاعرہ کے بہت سے راز سربستہ کھولتی بھی ہیں۔گویا اشتہار شعراء کا نہ صرف قد و قامت، ضخامت، جسامت، قدامت، عشرت، عسرت، تنگ دستی، بالا دستی، بلکہ ماضی، حال، مستقبل تک بتا دیتے ہیں۔یعنی اگر کوئی اپنے پسندیدہ شاعر کے حالات کا برسوں بعد دیدار اور مشاعروں کا اودار دیکھنا چاہے تو دیوار کو کرید کر سہارا لے سکتا ہے۔

بقول عزیز بانو وفاؔ

ہماری بے بسی شہروں کی دیواروں پر چپکی ہے
ہمیں ڈھونڈھے گی دنیا کل پرانے اشتہاروں میں

اب صرف دیوار ہی نہیں اخبار کے ''کلاسی فائیڈ'' اشتہار میں بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ جس طرح اخبار میں ہر قسم کے ذہنی، روحانی، جسمانی، آسیبی، جنسی، امراض کا علاج گارنٹی سے کرنے والے مختلف حکیم و نباض اپنا اشتہار دیتے ہیں۔اسی طرح بعض شعراء کے اشتہارات ان سرخیوں سے اخبارات کی زینت بنتے ہیں کہ ''کسی بھی وقت ولادت، وفات، رسم ختنہ، عقیقہ، سہرا، رخصتی، تہنیت، تعزیت کے لئے رجوع کریں۔معقول نذرانے پر گارنٹی کے ساتھ نظمیں دستیاب ہیں''

بعض شعراء دلیل دیتے ہیں کہ جب رحمٰن و رحیم خدا کی خواہش تھی کہ میں پہچانا جاؤں ۔اس لئے جن و انس، ملک، چرند، پرند کی تخلیق کی تا کہ وہ پہچان کر عبادت کریں۔تو کیا ''تلامیذ رحمٰن'' کو یہ حق نہیں حاصل کہ اپنی ذات کی شناخت کے لئے اشتہار کا سہارا لیں۔اس لئے

Scanned with CamScanner

مشتہر ہونے کے لئے مختلف حربے اپناتے ہیں۔ کبھی کبھی دوسروں کے وعدے کاٹ کر خود ان کے قائم مقام بن کر مشاعرے میں قیام کرتے ہیں۔ اگر ایک وعدہ کہیں سے نبھا کر آتے ہیں تو اگلے سال کا وعدہ سلامت رکھنے کی خاطر نہ صرف خدا سے دعا مانگتے ہیں بلکہ صاحب مشاعرہ سے سال بھر خط و کتابت، مراسلات، فون سے حال حقیقت دریافت کر فرضی ہمدردیاں بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی ہر تقریب تخریب کے موقع پر ہی نہیں بلکہ مرغی، مرغا کی ولادت، وفات پر تہنیت و تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اس میں ان کو کوئی قباحت و شرمندگی نہیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر میر تقی میر صاحب اپنے مرغا، بلی کی جنگ کو شعری قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔ مرغے کی موت پر مرثیہ لکھ سکتے ہیں تو کیا جدید شعراء اپنے پیٹ کے لئے چند کلمات تعزیت ادا نہیں کر سکتے۔

چونکہ زمانہ ''ڈیجیٹل انڈیا'' (رنگین بھارت) کا ہے تو اشتہارات بھی رنگین ہو گئے۔ قدیم زمانے میں شعراء کی تحریریں، تصویریں، اخباروں، رسالوں میں بلیک اینڈ وہائٹ پر منحصر تھیں۔ اب تو شعراء، ادباء کے شعری مجموعے دیوان، کلیات، ادبی ذخیرے، کمپیوٹر کی ویب سائٹ پر منتشر ہیں۔ بیپر بک، ای بک، فیس بک، فلیکس بیکس، ای میل، فی میل، فون، رنگ ٹون، مراسلات، مکالمات، مقالات، اسٹیکر، لاوڈ اسپیکر، شور و شر وغیرہ ان گنت ابلاغ کے ذرائع ایجاد ہو کر قارئین و سامعین و ناظرین سے باادب باملاحظہ ہوشیار کی فریاد کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اشتہار کے نئے طریقے رائج ہو چکے ہیں لہٰذا ''جوشیلے شاعر'' بیرون وطن مشاعروں کا اشتہار خود اپنے دست مبارک سے وطن عزیز میں چسپاں کر دیتے ہیں۔ ''شرمیلے شاعر'' یہ فریضہ اپنے عزیزوں، شاگردوں، بچوں کو سونپ کر قلبی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس نہج پر چلنے پر ان کو فائدہ ہو نہ ہو کم سے کم اہل وطن تو جان لیں گے کہ ان کی شہرت وطن کی سرحدوں کو عبور کر ریاستی، ملکی،

چونکہ زمانہ ''ڈیجیٹل انڈیا'' (رنگین بھارت) کا ہے تو اشتہارات بھی رنگین ہو گئے۔ قدیم زمانے میں شعراء کی تحریریں تصویریں، اخباروں، رسالوں میں بلیک اینڈ وہائٹ پر منحصر تھیں۔ اب تو شعراء، ادباء کے شعری مجموعے دیوان، کلیات، ادبی ذخیرے، کمپیوٹر کی ویب سائٹ پر منتشر ہیں۔ بیپر بک، ای بک، فیس بک، فلیکس بیکس، ای میل، فی میل، فون، رنگ ٹون، مراسلات، مکالمات، مقالات، اسٹیکر، لاوڈ اسپیکر، شور و شر وغیرہ ان گنت ابلاغ کے ذرائع ایجاد ہو کر قارئین و سامعین و ناظرین سے باادب باملاحظہ ہوشیار کی فریاد کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اشتہار کے نئے طریقے رائج ہو چکے ہیں لہٰذا ''جوشیلے شاعر'' بیرون وطن مشاعروں کا اشتہار خود اپنے دست مبارک سے وطن عزیز میں چسپاں کر دیتے ہیں۔

بین الاقوامی پیمانے تک پھیل چکی ہے۔ لہٰذا عزت و تکریم میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ پھر شہرت کا لبادہ اوڑھ کر سینہ کشادہ کر کے کہیں گے۔

عزت ملی اسے جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

کبھی کبھی جب مشاعروں کا قحط پڑتا ہے اور اشتہار نظر نہیں آتا تو موسم مشاعرہ کی آمد کے لئے فیضؔ کے شعر میں تحریف کرتے ہوئے مکرر دہراتے ہیں۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ شاعر کا کاروبار چلے

شعراء اتنی ہی کوشش کرتے ہیں اشتہار بازی کے لئے جتنا سیاست داں حکومت سازی کے لئے۔ ان کرامات و خرافات کے نتیجہ میں ایک اشتہار کئی کئی دفعہ شائع ہوتے ہیں۔ کبھی یہ شاعر داخل وہ شاعر خارج۔ ان عمل دخول و خروج سے شعراء کے درمیان کبھی اشتہاری جنگ شروع ہو جاتی ہے تو کبھی حاسدانہ جنگ۔ اور ان سرد جنگ کے نتیجہ میں اشتہار کئی ٹکروں میں اس طرح بٹ جاتا ہے جس طرح عہد ''گورباچوف'' میں ''سوویت روس'' کئی ملکوں میں تقسیم ہوا تھا۔ اشتہاری جنگ میں فاتح شعراء دبنگ ہو جاتے ہیں تو شکست خوردہ تنگ آ کر داخل سرنگ۔

بعض شعراء کی اشتہا (بھوک) کا وہ عالم ہے کہ اگر ہفتہ دو ہفتہ اشتہار میں ان کا نام نظر نہ آئے تو شعری آنت ''**قل ہو اللہ**'' ہی نہیں پورا ''کلام اللہ'' ختم کر دیتی ہے۔

پہلے شعراء اپنی نظموں، غزلوں، گیتوں، چال چلن، مقناطیسی بدن، منفرد طرز سخن سے پہچانے جاتے تھے۔ آگے چل کر اشتہار میں باتصویر بھی آنے لگے۔ اولاً جب اس بدعت کا آغاز ہوا تو بعض کم علم و سادہ لوح اسے ''تلاش گمشدہ'' کا اشتہار سمجھ کر لوگوں سے پوچھتے کہ یہ کون صاحب گم ہو گئے ہیں تو انہیں بتایا جاتا کہ یہ کھوئے نہیں بلکہ مل گئے ہیں۔ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر منعقد مشاعرے میں انہیں دیکھ

Scanned with CamScanner

آؤ۔

چونکہ شاعروں کا سینہ صرف کینہ ہی نہیں مختلف علوم وفنون کا خزینہ بھی ہوتا ہے۔اس لئے یہ جس حلیہ میں آنا چاہیں آسکتے ہیں۔اگر ''الف لیلہ'' کے جنات جذبات میں آکر خالی بوتل میں سما سکتے ہیں تو یہ فرط خوشی میں اشعار سنانے کے لئے چائے کی ہوٹل میں سما سکتے ہیں۔آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ہوٹلیں شعراء کی نشست گاہیں ہیں۔دوسرے رخ سے سوچو تو چائے خانے بھی ادب کی خدمت کررہے ہیں۔

یہ ابن الوقت ہی نہیں بنت الوقت بھی بن سکتے ہیں۔اگر دیش کی آزادی کے لئے عدم تشدد تحریک، عدم تعاون تحریک، نمک تحریک، بھارت چھوڑو تحریک، چل رہی ہو تو یہ ادب کی آزادی کے لئے ترقی پسند تحریک، رومانی تحریک، جدید تحریک چھیڑ دیتے ہیں۔اگر ملک کی آزادی کے بعد حکومت انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے محبت کا اظہار کر کے گئو شالہ، پشو شالہ کا افتتاح کرے تو فوراً یوٹرن لے کر ''کوی شالہ'' اور ''ادب شالہ'' کی بنیاد ڈال دیتے ہیں۔

اشتہار کی وہ دوڑ لگی ہے کہ زمانہ دنگ ہے۔ہورڈنگ کی وہ ہڑدنگ کہ شاہراہ تنگ ہے۔جدھر بھی نظر اٹھاؤ شعراء لٹکے ہوئے ہیں (اس لٹکنے سے دارورسن، پھانسی نہ سمجھیں) جس کے نتیجہ میں شاہراہوں پر اتنا انبار لگ جاتا ہے جتنا عہد خطوط نویسی میں عاشق ومعشوق کے محبت نامے سے۔اس کے لئے حکومت کو بھی نہ صرف حرکت میں آنا پڑا بلکہ ''سریع الحرکت دستہ'' تعینات کرنا پڑا۔صفائی مہم کے منصوبے بنائے گئے۔اشتہار کی کثرت سے ایک رضا کار نے جا بجا بورڈ آویزاں کیا جس کا عنوان تھا ''اپنے شہر کی شاعراؤں کو صاف رکھیں'' اب خدا معلوم اس کا مقصد شاہراہوں کو صاف کرنا تھا یا اسٹیج سے شاعرات کو معاف کرنا تھا۔

شاعروں کی متعدد قد آدم تصویریں دیکھ کر ایک نقاد تو یہاں تک کہنے لگے کہ اب وہ دن دور نہیں جیسے فلمی اداکار سلمان خان، شاہ رخ خان وغیرہ پیپسی، سیون اپ جیسے مشروبات اشتہار میں بیچتے نظر آتے ہیں اسی طرز پر شعراء اپنی نظموں، غزلوں، گیتوں، دیوانوں کو بیچتے نظر آئیں گے۔پھر بازاروں، دیواروں، اخباروں میں اس انداز سے اشتہار دکھائی دے گا۔

''ادبی راجدھانی میں زور دار دھماکہ، دہشتؔ دہلوی کے قلم سے''

''قلمی میدان میں زبردست معرکہ، خنجرؔ پانی پتی کے نوک قلم سے''

''شعری ہونٹوں پر شاندار مسکراہٹ، محترمہ تبسمؔ صاحبہ کی دل فریب آہٹ سے'' وغیرہ

چونکہ پہلے لکھنو، دہلی، حیدرآباد ہی نہیں تمام دبستانوں، شہروں، قصبوں، گاؤں میں اس قسم کے بازار لگتے تھے جہاں شعراء اپنی نظمیں، غزلیں صاحبان ذوق وصاحبان عشق کو فروخت کرتے تھے۔لگتا ہے کہ ماضی قریب میں بھی ان بازاروں میں رونق تھی جیسا کہ ساحرؔ لدھیانوی مرحوم نے ایک بار یہ تجارت کرتے ہوئے کہا تھا:

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

مشہور ومقبول ہونے میں ذرائع ابلاغ ''میڈیا'' کا بھی بڑا ہاتھ ہے یہ جس کو چاہیں وزیر اعظم تک بنا سکتے ہیں۔اس لئے جس کا ان پر قبضہ ہو جائے وہ شاعر اپنے کو خوش نصیب ہی نہیں اردو کا خطیب ونقیب سمجھے۔کہتے ہیں قدیم زمانے میں بعض شعراء کے کلام کو طوائفوں نے اتنا مقبول کیا کہ زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔آخر یہ طبقہ بھی تو ایک زمانے میں شعراء و شرفاء کا میڈیا تھا۔

جس طرح شیر شکار کے بغیر، مسلمان گوشت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ویسے شعراء کا بغیر اشتہار زندہ رہنا دشوار ہے۔جو شاعر جتنا بڑا بننا چاہتا ہے اتنی ہی بڑی تصویر کے ساتھ نظر آنا چاہتا ہے۔قد آدم اشتہار کے بے شمار فوائد ہیں۔شاعروں کے پرکشش، حسین وجمیل چہروں کو دیکھ کر ان کا ہمسر بننے والی خواتین کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔یہی نہیں آگے چل کر ان پر مختلف کمپنیوں سے اشتہارات کی برسات ہونے لگتی ہے۔فلمی دنیا سے نغمہ نگاری، اداکاری وہدایت کاری کے آفر بھی ملنے لگتے ہیں اور پھر تیزی سے کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے نہ صرف آگے نکل جاتے ہیں بلکہ بہت سے شاعروں، مشاعروں کو نگل جاتے ہیں اور پھر مقبولیت کا وہ عالم کہ آئے دن اخبارات، اشتہارات، نیوز چینل والے ''انٹرویو'' کے لئے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور ان سے مشتہر ہونے کی عظیم کامیابی کا راز، مقبولیت کا ''شارٹ کٹ'' پوچھتے ہیں تو یہ اپنا رعب و دبدبہ نہیں دکھاتے بلکہ نصیحت کے انداز میں'' اپنے اشتہارات کی طرف نہایت سادگی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں''

انہیں راستوں سے ہوکر اگر ہو سکے تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

□□□

Scanned with CamScanner

نذرِاقبال، نذرِعرشی، نذرِ قائم، نذرِ آزاد، نذرِمقبول اورنذرِمعین کی طرز پراویس سنبھلی نے اس مجموعۂ مضامین کومرتب کرکے پروفیسر شارب رودولوی کی ہمہ جہت شخصیت کامکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اوراسے 'شخصیت، مطالعۂ شارب اور طرزِ شارب' کے تین فصلوں میں تقسیم کرکے تکنیکی بنیادوں پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ شروع میں حرفِ آغاز کے نام سے اویس سنبھلی نے پانچ صفحے کا مختصر مگر جامع مقدمہ تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ 'شارب صاحب کی شخصیت اورفن سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی ادبی اورتنقیدی خدمات پرروشنی ڈالنے والے اوران کا محاکمہ کرنے والے مضامین بھی ہیں اور ان کی سدابہار و دلفریب شخصیت کا احاطہ کرنے والی تحریریں بھی' (ص:۱۱)۔ اس سے قبل انہوں نے شارب صاحب سے اپنے دیرینہ وابستگی کاذکر کرتے ہوئے لاشعور کی کارفرمائیوں کوسپردِقلم کیا ہے۔ایسے نوجوان یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں جواپنے بزرگوں کی خدمات کانہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ ان پرتنقیدی نگاہ ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

مجموعے کے پہلے حصے 'شخصیت' میں یوں توحفیظ نعمانی سمیت چھ نامور قلمکاروں کے مضامین کتاب کے اعتبار میں اضافہ کررہے ہیں لیکن عارف نقوی، پروفیسر شہزاد انجم کے مضامین اور مجتبیٰ حسین کے قلمی خاکے سے شارب صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں پربھرپور روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا حصہ 'مطالعۂ شارب' پر مشتمل ہے اور یہی مجموعے کا حاصل ہے۔ 'شارب کےتنقیدی سروکار' کے نام سے پروفیسر عقیل رضوی کا عالمانہ مضمون مجموعے کی شان میں چار چاند لگارہاہے۔ پروفیسر رضوی نے سیمیناروں کے اس دور میں لکھی جانے والی غیرمتوازن تنقیدی تحریروں پربات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شارب کی تحریروں میں کچی پکی باتیں داخل نہیں ہوتیں 'وہ اپنے فیصلوں میں subdued نہیں ہوتے۔ہاں! 'گوارہ' کی مسکراہٹ ضروران کی تنقیدی تحریروں میں کہیں کہیں بکھری ہوئی مل جاتی ہے'۔ اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ 'شارب بہت معمولی اورپیش افتادہ باتوں کے لیے بھی حوالے دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس سے خیال گزرتا ہے کہ کہ شاید انہیں محولہ حضرات کی خوشنودی مقصود ہے(ص:۵۸)'۔اسے انہوں نے شارب صاحب کی خرابی کےطور پر دیکھا ہے۔

اس حصے میں کل بیس مضامین شامل ہیں جن

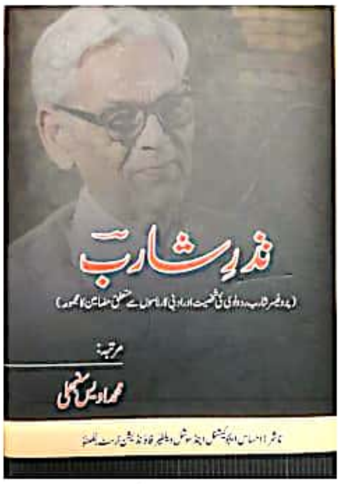

مرتبہ : محمد اویس سنبھلی

مبصر : شاہد حبیب

قیمت : ۲۹۹/روپئے

ناشر : احساس ٹرسٹ، لکھنؤ

ملنے کا پتہ : دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

میں پروفیسر علی احمد فاطمی، احمد ابراہیم علوی، ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر سراج اجملی، صفدر امام قادری، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر عمیر منظر اور ڈاکٹر نور فاطمہ جیسے معروف صاحبانِ قلم کے مضامین اہم ہیں۔ ان میں پروفیسر شارب ردولوی کی تنقید نگاری کے مختلف جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر مجاہد الاسلام کا مضمون 'اردو تنقید نگاری میں شارب رودولوی کے اختصاصات' نے جشنِ شارب کے سیمینار میں بھی توجہ کھینچا تھا اور حذف واضافے کے باوجود اس مجموعے میں شامل ہوکر شارب صاحب کی تنقید نگاری پر ایک الگ زاویۂ نظر سے گفتگو کررہا ہے۔ ڈاکٹر مجاہد نے احتشام حسین کا ایک جملہ نقل کیا ہے کہ 'مجھے آبگینوں کوٹھیس پہنچانے میں کبھی مزا نہیں آتا' اس جملے سے شارب ردولوی کے استاد اور مربی پروفیسر احتشام حسین کے طرزِ تنقید پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر مجاہد کا کہنا ہے کہ احتشام حسین کے شاگردِرشید شارب ردولوی کی تحریروں کو پڑھ کر اکثر جگہوں پر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے' (ص:۱۵۶) اس سے واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر شارب ترقی پسند نقاد تو ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی تنقید میں وہ تندی خال خال ہی نظر آتی ہے جو عام ترقی پسند نقادوں بطورِ خاص علی سردار جعفری اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ اسی حصے میں حمیرا عالیہ، شاہد رضی اور موسی رضا جیسے نوآموز قلمکاروں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اطہر حسین نے ڈاکٹر عرشیہ جبیں اور ڈاکٹر حسن مثنی کی تنقیدی کتابوں سے استفادہ کرکے پروفیسر شارب کی تازہ 'توقیت' ترتیب دیا ہے۔ لیکن جس طرح کتاب میں جگہ جگہ پروف کی غلطیاں در آئی ہیں، اس توقیت میں بھی یہ چیز جگہ پاگئی ہے۔

تیسرے حصے میں 'طرزِ شارب' کے عنوان سے پروفیسر شارب کی چار تحریریں شامل ہیں۔ یہ تحریریں ان کی عمرِ تالیف کے چار ادوار اور چار حیثیتوں کونمایاں کررہے ہیں۔ 'انیس کے مرثیوں کا سماجیاتی مطالعہ' مرثیے پران کی گرفت اور 'شمس الرحمن فاروقی اور نقدِ میر' غزل کی روایت اوراس کی تنقید پر پروفیسر شارب کی گہری نگاہ پر دلالت کرتے ہیں۔ 'یاد اس کی اتنی خوب نہیں' مرحومہ بیگم اورممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر شمیم نکہت کا خاکہ ہے اور آخری مضمون 'مسرور جہاں کی افسانہ نگاری' ۲۲ ستمبر ۲۰۱۹ کو وفات پائیں معروف فکشن نگار محترمہ مسرور جہاں کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ اس خوبصورت تحفے پراویس سنبھلی اور پروفیسر شارب ردولوی دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک۔ امید ہے کہ شایانِ شان استقبال ہوگا۔

□□□

زیر تبصرہ کتاب میں ابراہیم افسر نے بڑی ہی عرق ریزی اور جاں فشانی کے ساتھ کتاب کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے کتاب پر ۸۱ صفحات پر مشتمل، مفصل مدلل مربوط اور مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ابراہیم افسر نے اپنے مقدمے میں مختلف حوالوں کے ذریعہ رشید حسن خاں کی ادبی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔

دراصل اس کتاب میں ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں کی شخصیت سے متعلق مضامین کو یکجا کیا ہے۔ اس کتاب میں انیس میرٹھی کی تقریظ شامل ہے جس میں انھوں نے موجودہ دور میں ہونے والی سہل پسندانہ تحقیق کو اصل تحقیق ماننے سے گریز کیا ہے۔

ان کے مطابق عصر حاضر کی تحقیق اس لیے بامعنی ثابت نہیں ہو رہی کیونکہ مقالہ نگار اور نگراں دونو ں ہی اپنی ذمہ داریوں کے تئیں مخلصانہ رویہ نہیں رکھتے۔ انیس میرٹھی نے کئی مثالیں اپنی بات کی تصدیق کے لیے پیش کی ہیں۔ بہر کیف! انیس میرٹھی صاحب ابراہیم افسر کے ادبی کارنامے سے مطمئن ہیں اور ان کی تگ ودو کے قائل نظر آتے ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' خود رشید حسن خاں کا تحریر کردہ ہے۔ دوسرا مضمون 'رشید حسن خاں کی سوانح و شخصیت' خود کتاب کے مرتب ابراہیم افسر کا ہے جس میں رشید حسن خاں کی زندگی اور شخصیت کو مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ 'رشید حسن خاں: چند جھلکیاں' نامی مضمون نیر مسعود کا تبصرہ نما مضمون ہے۔

اطہر فاروقی کا مضمون ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'' میں بھی ان کے حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیدہ جعفر نے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں'' میں ان کے تمام تر ادبی کارناموں کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ ''قابل قدر عالم ، خوش اسلوب انسان'' انور خاں کا مضمون ہے۔ جو کہ اپنے آپ میں بے حد منفرد مضمون ہے۔ مزید ''رشید حسن خاں'' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مضمون ہے جس میں انھوں نے رشید حسن خاں کی ادب نوازی اور ادبی باریک بینی پر وقیع مضمون تحریر کیا ہے۔

''رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے'' مجتبیٰ حسین کا دلچسپ مضمون ہے۔ یوں تو کتاب میں

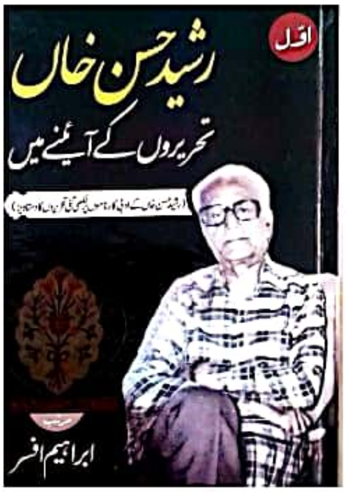

کتاب کا نام

رشید حسن خاں؛ تحریروں کے آئینے میں

مرتب : ابراہیم افسر

مبصر : ڈاکٹر ظفر عالم

قیمت : ۳۲۳ روپے

شامل بیشتر مضمون ایک دوسرے کے پرتو نظر آتے ہیں لیکن موصوف کا مضمون قدرے منفرد ہے۔ دراصل مضمون نگار نے رشید حسن خاں کے اس پہلو پر بے باکی سے لکھا ہے جو موجودہ دور کی ترجمانی کرتا ہے، حق گوئی و بے باکی ہی تھی جس نے رشید صاحب کو روباہی کا شیوہ نہیں اختیار کرنے دیا۔ مخمور سعیدی کا مضمون 'رشید حسن خاں' جو کہ وقیع مضمون ہے۔

''رشید حسن خاں: رفیق اور دوست'' شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے نامور استاد قمر رئیس کا مضمون ہے اور یہ مضمون کتاب میں شامل دوسرے مضامین سے اس لیے قدرے دیگر ہے کیونکہ موصوف رشید صاحب کے ہم وطن اور بچپن کے دوست تھے۔ راقم الحروف کے خیال میں قمر رئیس رشید حسن خاں کے ظاہر و باطن سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کے نفسیاتی ذہن کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے جو کہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ اردو ادب میں شخصی پرستی کی روایت گزرے ادوار سے چلی آرہی ہے۔ بڑے سے بڑے ادبا شخصی جکڑ بندی سے آزاد نہیں تھے۔

اس کتاب میں کئی مشہور و معروف ادیبوں کے وقیع مضامین ''رشید حسن خاں کی یاد میں'' از ڈاکٹر شمس بدایونی، ''رشید حسن خاں کی یاد میں'' از نکہت بریلوی، ''رشید حسن خاں یادوں کے آئینے میں'' از ڈاکٹر ٹی آر رینا ''یہ جو اپنے خاں صاحب ہیں نا'' از صدیق الرحمن قدوائی، ''بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد'' از ارجمند آرا، شامل ہیں جو رشید حسن خاں کی شخصیت اور ان کی ادبی کاوشوں پر بھر پور روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابراہیم افسر نے ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' کو پانچ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر لانے کا اردہ کیا ہے، علاوہ ازیں ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں کے انٹرویوز (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کو بھی یکجا کر سال ۲۰۱۹ میں شائع کیا ہے۔ موصوف کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی ''رشید حسن خاں کی ادبی جہات'' سے متعلق ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے مرحوم رشید حسن خاں کی شخصیت کے مختلف گوشوں سے قارئین ضرور روشناس ہوں گے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں ابراہیم افسر جنھوں نے اس کام کے لیے رات دن تگ و دو کی اور قوی امید ہے کہ ابراہیم افسر کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی۔

□□□

Scanned with CamScanner

شمارہ ستمبر تا نومبر نظرنواز ہوا۔ کاغذ، طباعت، سرورق سب دلکش و جاذب نظر ہے۔ منظوم حصہ نہایت معیاری اور وقیع ہے اور حصۂ منثور بھی اس سے کمتر نہیں۔ مضمون نگار ڈاکٹر محمد علی جوہر کا مضمون 'مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی' بہت معلومات افزا ہے۔ ان کی قربانیاں اور ان کی اخلاقی عظمت اور ان کی عالمانہ بصیرت آج بھی تاریخ کے ورق پر چمک رہی ہے۔

ڈاکٹر صفیہ فاطمہ کا گرانقدر مضمون 'اردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ' خواتین ناول نگاروں کی نسائی عظمت فن کا تاریخی دستاویز ہے۔ محترمہ نے رشید النساء سے لے کر موجودہ دور کی خواتین ناول نگاروں کی ناول نگاری پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھے۔ دوسرے مضامین بھی قابل توجہ ہیں۔ غزل اور افسانے بہتر ہیں۔

رسالے کے آخری اوراق پر خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطانپوری اور علی سردار جعفری کی غزلیں برق تپاں کی طرح چمک چمک رہی ہیں۔ یہ سب آپ کی پرخلوص مساعیٔ جمیلہ کی جلوہ طرازی ہے۔ اس کا معیار میرے خیال میں عہد حاضر کے رسائل سے بڑھ کر ہے تو کمتر بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ترقی عطا فرمائے۔

عبرت مچھلی شہری

ادبی نشیمن سہ ماہی'' رسائل و جرائد کی اس بھیڑ میں اپنی ایک نمایاں شناخت قائم کر چکا ہے۔ اس کی ادبی آواز میں کافی انفرادیت ہے۔ اسی انفرادیت کے سبب بہت کم عرصے میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا، حالانکہ ایسی مقبولیت بہت ہی کم ادبی رسالوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس رسالے کو یہاں تک پہونچانے میں بلا مبالغہ اس کے مدیر ڈاکٹر سلیم احمد کی ادبی مشقتوں کا ہاتھ ہے، چونکہ ڈاکٹر سلیم احمد بذات خود ایک اچھے قلم کار ہیں۔

''ادبی نشیمن سہ ماہی'' مجھے پابندی وقت کے ساتھ موصول ہوتا ہے، میں اس کا مستقل قاری ہونے کے ناطے اس بات کے اعتراف میں مجھے کوئی عار نہیں کہ اس میں شامل ہونے والے تمام مشمولات اپنا ایک معیار رکھتے ہیں۔ اس کے مشمولات میں شامل ہونے والے تخلیق کاروں میں بیشتر ریسرچ اسکالروں کے مضامین ہوتے ہیں، یہ ایک اچھی اور صحت مند پہل اردو ادب کی نئی نسل کی آبیاری کے لئے، اس اقدام کے لئے ایڈیٹر موصوف کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ گوشہ منثورات کے ساتھ منظومات کا گوشہ بھی ایک بہترین انتخاب ہے۔ اس میں کچھ کمیاں ضرور ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ مزید وقت کے ساتھ اس میں بہت سی ترمیمات اور اصلاحات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس رسالے کے ساتھ میری نیک خواہشات وابستہ ہیں۔ اس نیک پیش رفت کے لئے ہم ڈاکٹر سلیم احمد کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ وہ اسی آب و تاب کے ساتھ رسالے کی اشاعت کا سلسلہ جاری و ساری رکھیں۔

سید علی عاقل

کلگھر کمال، امبیڈکر نگر، اکبرپور

شمارہ نظر کے سامنے آیا۔ دل کو تسلی ہوئی۔ کور اور تزئین کاری لاجواب اور پرکشش ہے۔ سب سے عمدہ چیز جو اس شمارے کو دیگر شماروں سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس رسالہ کا آغاز حمد باری و نعت پیغمبرؐ سے ہوتا ہے۔ ایچ ایم تابش ردولوی کی نعت اور ہمسر موہانی کی حمد پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ایڈیٹر کا اداریہ کافی دقیق اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ لائق مطالعہ ہوتا ہے اور اس رسالہ کے ہر اداریے میں کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ ضرور ہوتا ہے جو سب کو بیک وقت متاثر کر سکے۔

مزید برآں جو مضامین اور غزلیں شامل اشاعت ہیں، وہ بہترین ہیں۔ عظیم مجاہد آزادی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے بارے مضمون کافی معلومات افزا ہے۔ سر سید احمد خاں پر دونوں مضامین کافی بہترین ہیں۔

منشی پریم چند کا افسانہ عید گاہ کافی مرتبہ پڑھا ہے لیکن ایک بار پھر جب نظر کے سامنے سے گزرا تو بغیر پڑھے رہا نہ گیا۔

ان سب کے علاوہ تمام تر تخلیقات عمدہ ہیں۔ اللہ محترم ایڈیٹر صاحب کو مزید اردو ادب کی خدمت کرنے کا موقع عنایت فرمائے۔

وفا زیدی

تحسین گنج، لکھنؤ

Scanned with CamScanner

’ادبی نشیمن‘ قارئین کرام کی خدمت میں یوم جمہوریہ کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

Vol 03 Issue 01-02
December 2019 To March 2020

Urdu Quarterly
Adbee Nasheman
Lucknow - 226 003

RNI No. UPURD / 2017 / 74845
Per Copy : 25/-
Annaul Subscription : 125/-

دستاویز

پیدائش: ۷/اکتوبر ۱۹۱۴ء
وفات: ۳۰/اکتوبر ۱۹۷۴ء

فیض آباد کے متوسط گھرانے میں اختر بائی کی پیدائش ۷/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ہوئی۔

اختری بائی کو موسیقی کا بیحد شوق تھا اس لئے ان کے چچا نے انہیں سارنگی کے مشہور استاد امداد علی خاں کے پاس پٹنہ بھیج دیا۔ استاد امداد علی خاں سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پٹیالہ گھرانے کے استاد عطا محمد خاں سے مزید تربیت حاصل کی۔ بیگم اختر کو قدرت نے بیحد سریلی آواز سے نوازا تھا۔ وہ زیادہ تر بہزاد لکھنوی کی غزل کو سحر انگیز آواز سے محفل کو مدمست کرتیں۔ بہزاد کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سے شعراء کی غزلوں کو آواز دی ہے۔ جب وہ ۱۵/برس کی تھیں تو انہوں نے پہلا عوامی پروگرام بہار کے زلزلہ متاثرین کی امداد کے لئے کلکتہ میں پیش کیا تھا۔ اس پروگرام میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں۔ کم عمر میں ایسی فنی مہارت دیکھ کر انہوں نے کہا تھا کہ آپ کے گلے کی تربیت تو قدرت نے خود کی ہے۔ اس میں جو سوز و ساز ہے وہ بالکل فطری ہے اور انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔ بیگم اختر کو ٹھمری اور دادرا میں ملکہ حاصل تھا مگر ان کی اصل شناخت غزل گائیگی بنی۔ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی اور گانے بھی گائے مگر ۱۹۵۸ء کے بعد انہوں نے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا مگر گلوکاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیگم اختر نے ۳۰/اکتوبر ۱۹۷۴ء کو احمد آباد میں پروگرام پیش کیا جو ان کا آخری پروگرام ثابت ہوا۔ اس طرح تقریباً نصف صدی تک اپنی گلوکاری سے سامعین کے دلوں پر راج کرنے والی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ ان کی مزار لکھنؤ کے معالی خاں سرائے میں رکھ رکھاؤ اور رنگ و روغن کی محتاج بنی ہوئی ہے۔

□□□

Printed,Published & Prop. by **Ahmad Rashiq** at **Nomani Printing Press, Baroodkhana, Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168, Almas Bagh, Hardoi Road, Lucknow **Editor: Dr. Saleem Ahmad**

Scanned with CamScanner